ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

# ندائے اعتدال

مارچ ۲۰۱۶ء

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

# فہرست مضامین


| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۱۔ | قرآن کا پیغام | لڑکیوں کی پرورش دخول جنت کا سبب | محمد عارف ندوی | |
| ۲۔ | اداریہ | فکری زاویے | مدیر | ۳ |
| ۳۔ | پیام سیرت | جذبۂ محبت کے ساتھ ایمان وعمل صالح..... | محمد فرید حبیب ندوی | ۱۱ |
| ۴۔ | خصائص و امتیازات | امت محمدیہ، خصوصیات وامتیازات (قسط-۱) | محمد قمر الزماں ندوی | ۱۳ |
| ۵۔ | اسلامی تعلیمات | اپنی بیویوں کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آؤ | مولانا ندیم احمد انصاری | ۱۸ |
| ۶۔ | // // | بے حجابی کا نتیجہ | غزالہ پروین | ۲۴ |
| ۷۔ | // // | علم، مقاصد وفوائد | ابوطلحہ ندوی | ۲۶ |
| ۸۔ | فکر اسلامی | مفکر اسلام-ایک مطالعہ (قسط-۳) | ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی | ۲۷ |
| ۹۔ | نقطۂ نظر | امریکہ کا سامراجی کردار اور امت مسلمہ | عبدالرشید صدیقی | ۳۰ |
| ۱۰۔ | // // | ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا | عطاء الحق قاسمی | ۳۶ |
| ۱۱۔ | نقد و نظر | عقل کل کا ماتم | ابوفہد | ۳۸ |
| ۱۲۔ | // // | منکر مہدی راشد شاذ | مفتی اسعد قاسم سنبھلی | ۴۲ |
| ۱۳۔ | // // | راشد شاذ ایام گم گشتہ کا ایک ورق (قسط-۱) | مولانا الیاس نعمانی ندوی | ۴۶ |
| ۱۴۔ | نظریہ تعلیم | نظام تعلیم کی ثنویت اور اسلام | محمد مجاہد ندوی | ۴۸ |
| ۱۵۔ | شخصیات و سوانح | مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کی تاریخی خدمات | محمد خالد ضیاء صدیقی | ۵۶ |
| ۱۶۔ | تنقید و ادب | عربی کے مشہور ادیب احمد امین کی خودنوشت..... | پروفیسر محسن عثمانی ندوی | ۶۰ |
| | آخری صفحہ | شاہانِ وقت کے ذریعہ علماء کی قدردانی | م۔ق۔ن | ۶۳ |
| | غزل | الٹ دے پردۂ تقدیر، سوچتا کیا ہے؟ | ماہر القادریؒ | |


❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

# فکری زاویے

## ہمارا نصاب ونظام تعلیم

میں نے چند ماہ پہلے بھی اس موضوع کو چھیڑا تھا اور آج پھر دانشوران قوم اور علمائے امت کی خدمت میں اس حساس موضوع کو درخواست والتماس کی شکل میں پیش کرنے کی اشد ضرورت محسوس کر رہا ہوں، آج ہمارا معاشرہ جس اضطراب وکشمکش کا شکار ہے وہ کسی صاحب عقل بلکہ صاحب حس پر مخفی نہیں، ہر ذی شعور کو اس کا بخوبی ادراک ہے، اس کے علاج کی متعدد کوششیں بھی ہوتی رہتی ہیں لیکن اصل سبب کا پتہ لگانے کی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی، جنہیں ادراک ہے وہ جانے کیوں کتراتے ہیں اور عملی کوششیں کرنا تو دور، اظہار حق سے بھی گریز کرتے ہیں۔

ہم نے کتنے ہی مفکرین کی تحریروں میں دیکھا ہے کہ اسلام ثنویت کا قائل نہیں، علم میں دوئی کا کوئی تصور نہیں، میں ہر طرح کی تفصیل سے قطع نظر یہاں صرف اسی کے ذکر پر اکتفا کروں گا کہ میرے نزدیک معاشرے کے اصل اضطراب، بے دینی، فساد، تنگ نظری، مذہب سے عدم واقفیت بلکہ مذہب بیزاری، عملی شعور کا فقدان، مادیت کی ہوس اور اسی کے پہلو بہ پہلو تنگ دستی و خستہ حالی، سیاسی اقتصادی اور معاشی بحران کا بنیادی سبب ہمارا نصاب ونظام تعلیم ہے، مدرسہ واسکول کی تقسیم نے ہماری قوم کو فکری اور سماجی ہر دو لحاظ سے مفلوج کر دیا ہے۔

جو اہل ثروت ہیں انہیں اپنے بچوں کو مدرسہ بھیجنے کی توفیق نہیں ہوتی، جو تنگ حال ہیں وہ مدرسوں کے دامن سے وابستہ ہیں، مدرسوں کی محدودیت سے قیادت اٹھنے نہیں پاتی، ان کے مقدر میں پیوندکاری کے سوا کچھ رہا نہیں، اور اسکولوں کے نظام سے حرص وہوس اور مادیت کی پوجا کے سوا کوئی درس نہیں ملتا، نصاب ونظام مدرسہ دنیا بیزار اس طرح بناتا ہے کہ نظام کائنات سے واقفیت تک نہیں ہو پاتی، اور جنہیں نظام کا کائنات کا علم ہوتا ہے وہ مذہب بیزار ہوتے ہیں، ایک طرف یہ سمجھ لیا گیا کہ حصول علم کا مقصد کسب دنیا نہیں، جبکہ یہ واضح ہے کہ دنیا بیزاری کی تعلیم انسانی سماج کو مطمئن کرنے کے لئے کافی نہیں، جبکہ دوسری طرف حصول علم کا مقصد ہی حصول دنیا قرار پایا، اس نظام کی بنیاد ہی مادیت پسندی، پرتعیش زندگی، دنیا کی زیب وزینت اور عیش و عشرت، ہوس وذخیرہ اندوزی اور خواہش پرستی پر رکھی گئی تو پھر مساوات ورواداری، حسن نیت وحسن سلوک، ملی شعور اور قومی دھن کا سوال کہاں! وہ نظام کچھ ایسا ہے جس پر قرآن کا یہ تبصرہ صادق آتا ہے فاعرض عن من تولی عن ذکر نا ولم یرد إلا الحیوۃ الدنیا ذلك مبلغهم من العلم، (ترجمہ: آپ ہماری یاد سے روگردانی کرنے والوں سے۔ جو صرف دنیا کے طالب ہیں۔ الگ رہیے، ان کے علم کی پہنچ یہیں تک ہے۔ (سورہ نجم ۲۹-۳۰) اس نظام کے فارغین کے نزدیک ملت کے فرائض، رشتوں کے تقدس اور معاشرے کے واجبات پر ہر آن خواہشات نفس اور دنیا کی دولت ومناصب زیادہ اہمیت رکھتے ہیں بلکہ وہاں تو فرائض دین اور واجبات بندگی کو بھی موخر کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا، لیکن اس کے ساتھ یہ منطق بھی سمجھ سے بالاتر ہے جو مدارس کے حصے میں آئی ہے کہ حصول علم کا مقصد دنیا بیزاری کو قرار دیا جائے، اور اس حد تک دنیا سے بیزار ہوا جائے کہ نان شبینہ

کے لالے پڑ جائیں، اپنے آپ کو اس طرح بنالیا جائے کہ دنیا اور نظام دنیا سے کوئی تعلق ہی نہ رہ جائے، اس صورت میں معاشرے کا بے لگام اور غیر متوازن ہونا بالکل واضح ہے، جو دیندار ہیں وہ بے وسائل اور سہولیات وضروریات سے محروم ہیں وہ اس لائق نہیں کہ دنیا کا نظام سنبھال سکیں اور معاشرے کی قیادت کا فریضہ انجام دے سکیں، اور جو سہولیات سے مالا مال ہیں، جن کے ہاتھ میں نظام کی باگ ڈور ہے وہ مذہب بیزار اور ملی شعور سے ناواقف ولاتعلق ہیں۔

ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہمارے ارباب نظر ایک بار غور کریں، زمانے کے تقاضوں کو سمجھیں اور ایسے نظام ونصاب کو جاری کریں جو معاشرے کی ضرورت پوری کرے، جس کے فارغین معاشرے میں توازن قائم کرسکیں، مذہب کو ایک ایسی قیادت فراہم کرسکیں جو خود کفیل، واقف کار اور زمانے کے تقاضوں کا علم رکھنے والی ہو، جس کے فارغین معاشرے کو یہ باور کرا سکیں کہ دین کا علم سب کے لئے ہے، قرآن کو پڑھنا اور سمجھنا سب کے لئے ضروری ہے، مسجدیں صرف مولویوں کے لئے خاص نہیں، قرآن کی درس وتدریس اور تعلیم وتعلم صرف چند لوگوں کا حصہ نہیں، اسی طرح ملت کی فکر، اس کے کمزور طبقوں کا بوجھ اور ملت کی ہمہ جہت خدمت وضرورت کسی ایک طبقہ کی ذمہ داری نہیں۔

ایسا کیوں نہیوں ہوتا کہ قرآن کریم سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے ہمارے علماء ایک انقلابی تحریک چلائیں، قرآن کریم کا ایک خطاب ہے ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر ((ترجمہ: اور ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان بنایا ہے، ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟؟) (سوۃ قمر ۱۷) درس وعبرت اور نصیحت حاصل کرنے کے لئے قرآن کریم کو آسان بنایا گیا ہے، اس کے مخاطب سب لوگ ہیں، یہ خطاب عامۃ المسلمین سے ہے، جب تک اس مقدار میں لوگ قرآن نہیں پڑھیں گے اپنی مذہبی کتاب کے مطالبات وواردات اس مقدار میں ان کے نصاب کا بنیادی حصہ نہیں ہوں گے تب تک نہ وہ اپنے آپ کو پہچان سکیں گے نہ معرفت خالق کا حصول ممکن ہوگا، نہ فرد کی زندگی کارآمد ہوسکے گی اور نہ افراد ملت کے کام کے بن سکیں گے، جہاں سے خدمت کا جذبہ، فرض شناسی اور ملی شعور کی آبیاری ہوتی ہے، دین ودنیا کا توازن قائم ہوتا ہے، ضروریات وخواہشات کا فرق معلوم ہوتا ہے جب اس کا نصاب ونظام میں حصہ نہیں رہے گا تو رجال کار اور افراد ملت تیار ہونے کے بجائے رجال بطن اور افراد مادیت کی بھیڑ تیار ہوگی، معاشرے کا توازن بگڑے گا اور امت پستی کا شکار ہوگی، ضرورت تھی کہ ایک ایسا نصاب ترتیب دیا جاتا اور مدارس اسلامیہ اس کو انقلابی تحریک کے طور پر اپناتے جس میں عصری علوم اور مذہبیات کی یکساں طور پر ثانویہ کے مرحلہ میں تعلیم دی جاتی، ہائی اسکول تک عربی/انگریزی/اردو/ہندی اگر زبان کے طور پر پڑھائی جاتی تو ریاضی وسائنس اور اس کے متعلقات اسکول کے نصاب کے مطابق پڑھائے جاتے اور قرآن وسیرت اور فقہ کی تعلیم اس مقدار میں دی جاتی کہ ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر کی منشا پوری ہوجاتی۔

یہاں پہنچ کر لوگ الحاق ومنظوری Recgnization اور Affiliation کا سوال کھڑا کریں گے، تو یاد رکھا جائے کہ مذکورہ موضوعات کی تدریس وتعلیم کے ساتھ ملک کے موجودہ بورڈز کے شرائط پوری کرتے ہوئے ان سے الحاق ومنظوری کچھ مشکل نہیں، جبکہ دوسرے مرحلہ میں یہ بھی ممکن ہے کہ ایک نیا تعلیمی بورڈ ہی حکومت سے منظور کرالیا جائے جو دیگر بورڈز کے مساوی ہو، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ پہلی شکل زیادہ آسان وموافق حال ہے۔

ہائی اسکول کے امتحان کے بعد کچھ طلبہ (ان کے رجحانات دیکھ کر) فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین (ترجمہ: تو ایسا کیوں نہ ہو، کہ ہر آبادی سے ایک تعداد نکلے تاکہ دین میں تفقہ حاصل کرے۔) (سورہ توبہ ۱۲۲) کی منشا

پوری کرنے کے لئے منتخب کر لئے جاتے اور بقیہ کو فکری طور پر مسلمان بنا کر کے اب دوسرے ملی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے دیگر شعبہائے تعلیم میں بھیج دیا جاتا، تفقہ فی الدین کا شعبہ تو فوری طور پر مدارس اپنے یہاں ہی رکھتے بقیہ کے لئے تو عصری ادارے موجود ہیں، (مستقبل میں توفیق الٰہی شامل حال ہو تو اہل مدارس دیگر شعبے بھی قائم کر سکتے ہیں) بچپن میں دیا گیا قرآنی سبق اور سیرت نبوی کا درس انسان کے آخر تک کام آتا ہے، اس صورت میں یہ افراد جب کاروبار زندگی سنبھالیں گے تو مذہب بیزار اور ملی شعور سے عاری نہ ہوں گے، کیوں کہ وہ جس نظام کے فارغ ہوں گے اس کی بنیاد دین و دنیا کی تقسیم پر نہیں بلکہ دنیا کو دین کی خدمت میں لگانے پر ہوگی، ان کے سامنے فھل من مدکر کا نعرہ ہر وقت گونجے گا اور ہر موڑ پر آیات وعید انہیں روکیں گی، قرآنی دروس وعبران کی رہنمائی کریں گے، تو آیات بشارت انہیں دنیا بیزاری پر مجبور کریں گی، پھر تفقہ فی الدین والی جماعت بھی یکسو ہوگی، اسے ان افراد ملت کا تعاون حاصل ہوگا اور یہ افراد اس جماعت کی سرپرستی کو غنیمت سمجھیں گے نہ کی ان کے وجود کو بوجھ، اس کے برخلاف صورت حال یہ ہے کہ اسکولوں کے ۹۰ فیصد طلبہ قرآن فہمی تو دور تلاوت قرآن کی صلاحیت سے بھی محروم ہوتے ہیں جبکہ مدارس کے طلبہ کی تلاوت قرآن باعث برکت شمار کر لی جاتی ہے، معاشرے کے اضطرابات اور مادیت کی ریشہ دوانیاں اب تو انہیں قرآن میں غور وفکر کا بھی موقع نہیں دیتیں۔ اس صورت حال میں ملی قیادت کا کیا سوال۔ وہ تو اس تقسیم کے پیچ وخم میں الجھ کر رہ گئی ہے، فارغین مدارس سے شکوہ ہے کہ یا تو وہ ملت کی قیادت کے اہل نہیں کیوں کہ وہ زمانے کے تقاضوں سے ناواقف ہیں یا یہ رجحان ہے کہ مولوی ہے، محراب ومنبر کی زینت بنے، اسے سیاست وقیادت سے کیا مطلب، کیوں کہ دین وسیاست کو جمع کرنا ہی سخت گناہ ٹھہرا۔ دوسری طرف وہ طبقہ ملی قیادت کو تو اپنا حق سمجھتا ہے لیکن اس عنوان کے حسن کو اپنے مفادات کی چوکھٹ پر قربان کر دیتا ہے، مذہب بھی اس کے تیر ونشتر سے محفوظ نہیں رہ پاتا، مذہبی تشخصات اس کی نظر میں بچوں کے گھروندوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

یقیناً بعض لوگوں نے اس جانب پیش رفت کی ہے لیکن وہ نہ کے برابر ہے اور اس کا بھی از سر نو جائزہ ضروری ہے، اور جن لوگوں نے اس سمت کوشش کی ہے وہ بھی اپنے آپ کو تجارتی ذہنیت سے دور نہیں رکھ پائے ہیں الا ماشاء اللہ کہ ان کے اداروں میں ادنی طبقہ کا تو گزر نہیں، متوسطین کو بھی دس بار رخ کرنے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے، اس وقت حیرت کی انتہا نہیں رہ جاتی جب بڑے بڑے دانشور حضرات محض اس پر داد وتحسین کی باڑ لگا دیتے ہیں کہ کسی نے ایک ہی کیمپس میں دینی وعصری تعلیم کا انتظام کیا ہے، آخر اس کا کیا فائدہ کہ وسائل کا وہی استعمال ہوا جس سے امت کو کوئی نفع نہیں، مسائل جوں کے توں باقی رہ گئے، ان اداروں اور دیگر تجارتی اداروں میں فرق کیا رہا یہ سمجھنے اور سمجھانے کی کسی کو ضرورت نہیں، ایک مدرسہ قائم ہوا، پھر اس کے سہارے دیگر تعلیمی ادارے قائم ہوئے، ایک طبقہ اسی طرح کسمپرسی کا شکار رہا، بلکہ اس کو اس لائق بھی نہیں بنایا گیا کہ ملک کی موجودہ صورت حال میں دعوتی فریضہ سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کے لائق ہوتا، معلوم نہیں لیکون للعالمین نذیراً اور کنتم خیر امة للناس کے تقاضے کب پورے کیے جائیں گے اور کون لوگ پورے کریں گے، رہا دوسرا طبقہ تو اب تک وہ اس کمپس میں نماز وغیرہ کی پابندی کیا کرتا تھا، لیکن کیا اسے اس حد تک فکری طور پر مسلمان کر دیا گیا تھا کہ آئندہ جس ماحول میں وہ رہے وہ ماحول اس کے ملی شعور کو باقی رہنے دے، اسے پیسہ کمانے کی مشین نہ بننے دے اور وہ فرد ملت ہونے کے تصور کو لے کر عملی میدان میں کچھ کام کر سکے، بات جوں کی توں ادھوری رہتی ہے، وہی تفریق مذہبی اور غیر مذہبی، دینی اور عصری کی باقی رہتی ہے لیکن ستم ظریفی دوراں ہے کہ اچھے اچھے اہل نظر اور ارباب دانش محض اداروں کے وجود پر سر دھنتے ہیں۔ تاہم ہمارے یہاں ایسے اداروں کی بھی کمی نہیں جو صرف اور صرف ملت کے اموال سے وجود میں آتے ہیں لیکن خالص مغربی اور غیر اسلامی طرز پر چلتے ہیں، تجارتی منڈی میں ان کا

معیار بھی اس قدر بلند ہوتا ہے کہ متوسطین بھی داخل ہونے کی نہیں سوچ پاتے، وہاں پڑھنے والے جب اس قدر پروفیشنل نظام سے فارغ ہوتے ہیں تو ملت کے کام کے کیوں کر بن سکتے ہیں، لیکن تعجب اس پر کہ پھر بھی ایسے اداروں کے منتظمین اور قائم کرنے والے تعلیمی میدان کے معمار شمار کیے جاتے ہیں، انہیں بھی مسیحا کہا جاتا ہے جو ایجوکیشنل مافیا ہوتے ہیں۔

اس کام کی تحریک علماء اور واہل مدارس ہی چھیڑ سکتے ہیں، ان کے پاس وہ قوت اور جذبۂ عمل بھی ہے جس کی ضرورت ہے اور پہلے سے عمارتیں اور ضروریات بھی میسر ہیں ان کے صحیح اور وقت کے تقاضہ کے مطابق استعمال کی ضرورت ہے، الگ سے ادارے بنانا بہت مشکل ہے، لیکن موجود اداروں کے نظام کو انقلابی بنانا بہت آسان ہے، ترکی میں ایسے جامع نظام ونصاب کا کامیاب تجربہ کیا جاچکا ہے، اس نظام ونصاب نے جن افراد کو پیدا کیا ہے، وہ آج اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی کوششوں میں مصروف ہیں، اپنی ذات کو وہ فرد ملت سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے یہی وجہ ہے کہ وہ ملت میں ہی گم رہتے ہیں، ان کے جذبات واقدامات تاریخ کا حصہ بنتے جارہے ہیں، ہندوستان کے حالات اس بات کے داعی ومتقاضی ہیں کہ ہم بہت جلد اپنے نظام ونصاب تعلیم میں یہ انقلابی تبدیلی پیدا کریں ورنہ ہمارا مذہبی تشخص بھی اسی طرح خطرات سے دوچار ہوگا جس طرح ہماری ملی قیادت بھنور میں ہچکولے کھارہی ہے۔

## ائمہ اور مساجد انتظامیہ

عموماً ہمارے معاشرے میں یہ تصور عام ہوگیا ہے کہ جو قرآن پڑھے اور پڑھائے وہ کوئی بے بس وبے چارہ ہی ہوگا، جو مساجد میں امامت کے باوقار منصب پر فائز ہو وہ کوئی مصیبت کا مارا ہی ہوگا، یہی وجہ ہے کہ مساجد کی کمیٹیوں اور متولیان مساجد کا رویہ حضرات ائمہ کے ساتھ انتہائی آمرانہ، حاکمانہ اور بڑی حد تک متعصّبانہ بلکہ بعض مرتبہ تو دیکھا گیا کہ انتہائی بدبختانہ ہوتا ہے۔

ائمہ مساجد کے تعلق سے بالخصوص اور عام طور پر تمام مولویوں کے متعلق یہ طے کرلیا گیا ہے کہ نہ ان کی واجبی ضروریات زندگی ہیں اور نہ ان کے پاس دل ہے، جب دل ہی نہیں تو خواہشات کا سوال کہاں؟؟ نہ انہیں دوا علاج کی ضرورت پڑتی ہے، نہ وہ کھانا کھاتے ہیں، نہ ان کے والدین ہوتے ہیں اور نہ بیوی بچے، نہ ان کو چھٹیوں کا تقاضہ ہوتا ہے نہ ان کے لیے سردی وگرمی کوئی معنی رکھتی ہے، نہ ان کے اور ان کے بیوی بچوں کو لباس کی ضرورت ہے اور نہ ان کے بچے اچھی تعلیم کے حقدار، بلکہ امام ایک ایسا بندھوا مزدور ہے جس کے ساتھ کھیلنے کا متولیان مساجد کو بھرپور حق ہے، جو چاہے اسے دروازہ بند کرنے کا حکم دے، جس کی مرضی ہو اس سے صفائی کے متعلق سوال کرے، کمیٹی کا جو ممبر چاہے اس بے چارے کو دبالے، جس کا کہیں بس نہ چلے وہ مسجد کے امام پر زور آزمالے، اور یہ بے چارہ امام دوروٹی کے لئے سب کی سنتا ہے، سب کی سہتا ہے اور ہر وقت یہی خوف دامن گیر رہتا ہے کہ اب نکالا گیا اور تب نکالا گیا، مسجد میں وضو کے پانی کا انتظام، صفائی کا نظام اور سارے صاحبان کی آمد سے قبل روشنی کا نظم اور سب کے چلے جانے پر ایک ایک بلب کے بجھانے کی ذمہ داری سب اسی غلام کو اٹھانی پڑتی ہے۔

مجھے واقعات لکھنے اور بڑھا چڑھا کر بات کرنے کی عادت نہیں ورنہ ایسے دلدوز واقعات میرے علم میں ہیں جنہیں سن کر سوائے کف افسوس ملنے کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا، ہم نے خود بعض ائمہ کو دیکھا ہے کہ کس طرح وہ نفس کشی کرتے ہیں اور کس طرح اپنے بچوں کا دل مارتے ہیں، ہم نے دیکھا ہے اس قوم کی بے حسی اور بے غیرتی کا حال کہ کس طرح ''امام مسجد'' ہاں امام مسجد لوگوں کے گھروں پر کھانے کے لئے کھڑا رہتا ہے، جی! ہم نے دیکھا ہے ایسے اماموں کو جن پر ہر وقت متولی کا خوف سوار رہتا ہے، ہم نے دیکھا ہے ایسے ائمہ کو جن سے متولی خدمت بھی لیتا ہے اور انہیں دوسرے کے خلاف استعمال بھی کرتا ہے، ان سے جھوٹ بھی بولنے کو کہتا ہے، ہم نے دیکھا ہے ایسے ائمہ اور مدارس کے مدرسین کو جو آج بھی ایک خوراک کھانے میں میاں بیوی کھا کر شکم سیر ہوجاتے

ہیں، ہم نے دیکھا ہے ایسے ائمہ اور مدرسین کو جن کے بچے دودھ اور دوا کو ترستے ہیں، جنہیں کبھی اچھی غذا میسر نہیں آتی ہے، ایسے علماء کی آج بھی ایک بڑی تعداد ہے جن کی عفت وعظمت اور خودداری وغیرت مندی انہیں دست سوال دراز کرنے سے روکتی ہے لیکن وہ اندر اندر گھٹ گھٹ کر مرتے اور کڑھتے ہیں، ذرا سوچیے اگر اس غریب یا متوسط انسان نے اپنے اس لخت جگر کو کسی کام میں لگایا ہوتا، کوئی ہنر سکھایا ہوتا اور سب والدین ایسا ہی سوچنے لگتے تو کیا ہوتا آپ کا، کہاں ملتے آپ کو امام ومؤذن، کہاں ملتے آپ کے بچوں کو قرآن مقدس پڑھانے والے، لیکن کم از کم یہ تو ہوتا کہ یہ لڑکا جو آج تمام مصلیوں کی خدمت کر رہا ہے، اپنے والدین کے بڑھاپے کا سہارا بنتا، بہت زیادہ مال سے نہیں تو جسمانی طور پر اپنے ماں باپ کی خدمت تو ضرور کر لیتا، مدارس کا مذاق اڑانے والے اور علماء کو اپنی زکوۃ وخیرات کا دھونس دینے والے سوچیں کہ ان میں سے کتنے لوگ ہیں جن کی اپنی نماز درست ہے چہ جائیکہ دوسروں کی امامت کریں، کتنے ایسے ہیں جن کو اذان کے الفاظ بھی یاد ہیں یا صحیح تلفظ سے نکلتے ہیں، کتنے ایسے ہیں جو اپنے گھر کی میت کو مسنون طریقہ سے غسل دے سکتے ہیں، کتنے ایسے ہیں جو ہر موسم اور ہر وقت مسجد جا کر اسے آباد کر سکتے ہیں، بعض مساجد تو ایسی ہیں جن کے مصلی موسم کی نزاکت دیکھ کر ہی مسجد آتے ہیں، دینداری کا بہت سے ڈھونگ رچانے والے بھی اپنا محاسبہ کریں کہ ایک حافظ قرآن اور حامل علوم قرآن کی ان کی نظر میں کیا حیثیت ہے، اس کی زندگی کو وہ کس نظر سے دیکھتے ہیں، جس قوم کی نظر میں اس کے مذہبی پیشواؤں کی حیثیت نوکر وغلام کی ہو جائے وہ قوم غلامی کی زندگی میں نام تو پیدا کر سکتی ہے لیکن امامت وسیادت اس کا مقدر کبھی نہیں بن سکتی۔

اکثر وبیشتر مساجد کا حال یہ ہے کہ وہاں ائمہ کی تنخواہیں 5000 سے زائد نہیں ہوتی ہیں، ممکن ہے کچھ مساجد اس سے مستثنی ہوں، جن مساجد کے کم وبیش سب مقتدی ومصلی پچاس ہزار سے زائد آمدنی والے ہوں ان مساجد کے ائمہ ومؤذنین بھی اپنا دل دبائے بیٹھے رہتے ہیں، بلکہ ان مساجد میں طعن وتشنیع اور کمیٹی کے ممبران ومتولی کی نظریاتی غلامی کا بوجھ مزید اٹھانا پڑتا ہے، جس قوم کی صورت حال یہ ہو کہ وہ اپنے ائمہ ومؤذنین کا خون چوسے اور ان کو بنیادی سہولیات زندگی تک سے محروم کر دے اس قوم پر رحمت خداوندی کا نزول بظاہر ممکن نظر نہیں آتا، نہ جانے کتنے ائمہ ایسے ملیں گے جن کی زندگیاں مسجد کے حجرے میں ختم ہو گئیں یا کرایہ کے خستہ حال مکانوں میں اپنی زندگیاں ختم کر ڈالیں مگر مسجد کے مصلیوں کو یہ توفیق نہ مل سکی کہ ان بے چاروں کے گھر کا بھی انتظام ہو جاتا تاکہ ان کے بعد ان کے بچوں کو بھی ایک چھت میسر آجاتی۔

بہت سی مساجد میں فنڈ موجود ہوتا ہے لیکن اسے ائمہ ومؤذنین کی تنخواہوں میں استعمال نہیں کیا جاتا، مسجد کی تعمیر اور رنگ وروغن پر تو کروڑوں اور لاکھوں خرچ کیے جا سکتے ہیں لیکن امام ومؤذنین کو تنخواہیں دینے میں بخالت کی انتہا ہو جاتی ہے، کچھ رعونت پسند تو یوں ستم بالائے ستم ڈھاتے ہیں کہ اپنی محرومی پر نظر نہیں جاتی اور امام ومؤذن کا تعارف یوں کراتے ہیں ''بے چارے یہی ہمارے امام ہیں''، ''بے چارے امامت کر کے اپنی گزر بسر کرتے ہیں''، شاید ان رعونت پسند اور بے توفیق لوگوں سے جب روز قیامت اللہ تعالیٰ حساب لیں گے تو جواب دیتے نہ بن پڑے، وہاں اسی امام ومؤذن اور حافظ قرآن کی عزت وتکریم دیکھ کر شاید حسرت سے یہ لوگ سوچیں کاش اپنے بچے کو بھی اسی کام میں لگایا ہوتا، کاش ہم خود کسی حامل قرآن کی خدمت میں رہے ہوتے، کاش ہم نے کسی امام کے جوتے سیدھے کیے ہوتے، کاش ہم بھی کسی کے حفظ قرآن کا سبب بن گئے ہوتے۔

حیرت کی انتہا تو تب ہوتی ہے جب بعض ایسی مساجد پر نظر پڑتی ہے جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کے امام ومؤذن کے پاس تو گھر بھی ہوگا اور تنخواہ بھی ضروریات زندگی کو پوری کرنے کے لئے کافی ہوگی، لیکن اف رے ظلم یہاں بھی وہی پانچ اور چھ ہزار بس۔ اس پر دھونس اور پابندی گویا جہنم کے سارے داروغہ یہیں اتر آئے ہوں۔ چند منٹ نماز پڑھنے کو آتے ہیں لیکن مسجد

کا ڈکوریشن ماشاء اللہ، ایئر کنڈیشن بھی اب اکثر مساجد میں ہوتا جارہا ہے، آئے دن استنجاخانوں کی بھی مرمت ہوتی رہتی ہے، سہولیات کی کوئی کمی نہیں رہنے پاتی، لیکن جس بے چارے کی پوری زندگی مسجد سے وابستہ ہے اور جس کے بغیر یہ سب محتاج ہوجاتے ہیں اس کے لئے سہولت ہے نہ اس کی کوئی ضرورت ہے اور نہ اس کو چھٹی ہے، وہ بے چارہ اگر کوئی اور روزگار کرنا چاہے تو سب در پہ آزار ہوجاتے ہیں، اگر آمدنی کا کوئی اور راستہ بھی ساتھ میں اختیار کرنا چاہے تو فوراً اس کے نکالنے کی تدبیروں میں لگ جاتے ہیں، اور مفت کا کوئی دوسرا بندھوا غلام تلاش کرنے لگتے ہیں، کبھی اس طرف نظر نہیں جاتی کہ یہ بھی ایک انسان ہے، اس کے بھی جذبات ہیں، اس کے بھی اہل وعیال ہیں، اب مسلمانوں کی حکمرانی نہیں رہی جو اس کو حکومت سے وظیفہ ملے، اب تو یہ ذمہ داری عوام اور متعلقین مساجد کی ہے، اکثر مساجد ایسی ہیں اور بالخصوص ہر شہر کی اکثر مساجد کا یہی حال ہے کہ اس کے مصلیوں میں ایک ایسی تعداد ہوتی ہے جس کو اگر اپنی ذمہ داری کا صحیح احساس ہوجائے تو کوئی امام ومؤذن بنیادی سہولیات اور ضروریات زندگی سے محروم نہ رہ جائے، ہر مسجد میں ایسے دس پندرہ لوگ موجود ہوتے ہیں جن کو اگر دین کا صحیح تصور ہو اور وہ امام ومؤذن کے حقیقی مقام ومرتبہ سے واقف ہوں اور اپنے پاس موجود دولت پر شکر کی توفیق انہیں حاصل ہو تو یہی دس پندرہ لوگ امام ومؤذن کی اچھی تنخواہ کا اس طرح انتظام کرسکتے ہیں کہ کسی ایک کی جیب پر بار نہ ہو، لیکن قارونیت اور قارونی جذبہ کا کیا رونا رویا جائے، دیکھا گیا ہے کہ جس گھر کی ماہانہ آمدنی ڈیڑھ سے دولاکھ اور اس سے بھی زائد ہوتی ہے اس گھر سے مسجد کے لئے 100 روپیہ ماہانہ بھی بڑی مشکل سے نکلتے ہیں۔

میں نہیں سمجھتا کہ اس قوم کی صورت حال بدلنا ممکن ہے جس قوم نے قرآن کے طالب علموں اور اس کے حاملین کو بے کس ونادار سمجھ رکھا ہو، انہیں معاشرے کا کمزور وپسماندہ طبقہ بنا کر رکھ چھوڑا ہو، ان کی حالت یہ کردی گئی ہو کہ انہیں قابل ترس اور لائق رحم سمجھا جانے لگے، وہ متولیوں اور مساجد کی کمیٹیوں کے رحم پر جینے پر مجبور ہوجائیں، اس کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں وہیں بڑا سبب یہ ہے کہ ذمہ داران مساجد ائمہ ومؤذنین کے مقام سے واقف ہی نہیں، ان کی ضروریات کا انہیں احساس ہی نہیں، یاد رکھا جائے کہ دنیا میں کوئی معزز ترین شخص اہل دنیا کے نزدیک تو محترم ومعزز ہوسکتا ہے لیکن اللہ کے یہاں ایک حافظ قرآن کا جو مقام ومرتبہ ہے (جس کے بیان کا یہ موقع نہیں) اسے دیکھ کر یہ اہل ثروت اور دنیا پرست روز قیامت ہاتھ ملیں گے اور سوچیں گے کاش ان کے گھر میں بھی کوئی حافظ ہوتا، کاش انہوں نے کسی حامل قرآن کی قدر کی ہوتی، کاش کسی خادم قرآن کے پیر کی جوتی بن گئے ہوتے، کسی کی ضرورت اور کسی کا لباس بن گئے ہوتے۔

مجھے ائمہ اور مؤذنین سے بھی دست بستہ گزارش کرنی ہے کہ وہ اپنے مقام ومرتبہ کو سمجھیں، اپنے آپ کو پہچانیں، اکثر وبیشتر دیکھا گیا ہے کہ وہ علم سے کورے ہوتے ہیں، بے صلاحیت ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی وہ مساجد کمیٹیوں کے انتشار کا سبب بھی بن جاتے ہیں، ایسی چھوٹی چھوٹی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں کہ علم وعلماء کا وقار مجروح ہوتا ہے، انہیں اپنے سامنے حضرت صدیق اکبر کی امامت کا اسوہ رکھنا چاہیے اور حضرت بلال کی موذنی کا جلوہ دیکھنا چاہیے، انہیں ایسے رزق کی عادت نہیں ڈالنی چاہیے جس سے ان کی پرواز میں کوتاہی آئے، انہیں اپنے آپ کو دو رکعت کی امامت میں مقید اور محدود نہیں کرنا چاہیے، انہیں کم از کم اپنی اپنی مساجد کے متعلقین کا فکری، علمی اور سماجی قائد ہونا چاہیے چہ جائیکہ وہ فکری غلام اور بندھوا مزدور بن کر رہ جائیں، انہیں لوگوں میں مسجد کی پاکی وصفائی کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے، لوگوں کو سکھانا چاہیے کہ پیغمبروں کو اس کی صفائی کا حکم دیا گیا ہے، ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے وطهر بيتي للطائفين والقائمين والركع السجود۔ (ترجمہ: اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، نماز پڑھنے والوں، اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھنا) (حج۔۲۶) جب پیغمبروں کو اس کا حکم دیا جا

رہا ہے کہ وہ خانۂ خدا کی صفائی ستھرائی کا انتظام کریں تو عام لوگوں کے لئے تو یہ بڑے فخر اور شرف کی بات ہے، لیکن افسوس ہے کہ خود حضرات ائمہ اپنی حیثیت بھول گئے، انہوں نے اس مقدس منصب کو بے چارگی، بے بسی اور متولیوں کی اجارہ داری اور نظریاتی وفکری غلامی کا منصب بنا ڈالا، وہ بھول گئے کہ اسی منبر پر کھڑے ہو کر ائمہ اسلام دینِ حق کا اعلانِ عام کیا کرتے تھے، لوگوں کو لگام دیا کرتے تھے، بے دینوں اور بدفکروں کو للکارا کرتے تھے، حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان پر نقد کیا کرتے تھے، اپنے عمل اور اپنی شخصیت کا سارا وزن ڈال دیا کرتے تھے، ائمہ اور مؤذنین کو بھی سنجیدہ ہونے اور اپنے منصب کو پہچاننے کی ضرورت ہے، لیکن اس سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ عوام اور ذمہ داران مساجد ومدارس اپنا محاسبہ کریں، مولویوں کو اسی دور اور اسی معاشرے میں جینے والا ایک ایسا انسان سمجھیں جس کو ضروری غذا اور ضروری دوا علاج کی اور واجبی ضروریات زندگی کی ہمہ وقت ضرورت ہے، کوئی کسی قدر متقی ہو جائے، زہد وورع کی انتہا کو پہنچ جائے مگر اس کے اور اس کے اہل خانہ کی ضروریات اور واجبی تقاضے تو بہر حال باقی رہتے ہیں، تعمیر وتزئین سے بہتر ہے کہ ان بندگان خدا کی ضرورتیں پوری ہو جائیں جو بہر حال ان کروڑوں انسانوں سے بہتر ہیں جن کی زندگی بارگاہ خدا میں سجدہ کرنے سے محروم اور اغیار کے در پر سجدہ ریز رہتی ہے۔

## علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار:

آج کل حکومت کے آمرانہ رویہ کے باعث مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کا مسئلہ بہت گرمایا ہوا ہے، یہاں اس کی ان تفصیلات کا بیان تفصیل لا حاصل کے مرادف ہوگا جو اکثر مضامین کا حصہ بن چکی ہیں اور اخبارات کے توسط سے قارئین تک پہنچ چکی ہیں، دراصل اس طرح کے مسائل پنپتے کیوں ہیں، اس سمت میں ہم کو غور کرنا چاہیے، مولانا آزاد کے ایک خطاب کا یہ حقیقت پسندانہ اور جرأت مندانہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''قوموں اور ملکوں کی زندگی کا نہیں۔۔۔۔ بلکہ اسلام کی زندگی کا سوال ہے، فرض کیجئے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے تمام منصوبے پورے کر لیے اور ان کا ہر فرد تعلیم اور دولت کا ایک مرتب طلائی بت بن گیا لیکن اگر سرے سے خود اسلام کی سیاسی طاقت پر چھری چل گئی تو پھر علی گڑھ میں یونیورسٹی ہی نہیں بلکہ چاندی اور سونے کی بہشت شداد بھی بن جائے گی مگر اس کے حور وغلمان کس کا ترانہ گائیں گے''

مولانا آزادؒ کے یہ جملے کس قدر طاقت ور، جامع اور معنی خیز ہونے کے ساتھ دور اندیشی پر مبنی ہیں، اس کا اندازہ قارئین کو ہو چکا ہوگا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لئے مسلمانوں کی قربانیوں کا انکار کرنے کے جرأت بس وہی کر سکتا ہے جس کی فطرت میں ہٹ دھرمی ہو اور جو ظلم وبے انصافی کا خوگر ہو اور امن دشمنی کا رسیا ہو، لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے کہ مسلمان بار بار اپنے ملی مسائل کے لئے الجھتے رہتے ہیں، ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک وہ ملی مسائل کی زلف خم دار کو سلجھانے سے نجات نہیں حاصل کر سکے ہیں، کبھی وہ تاریخ کو بدل دیے جانے پر نالاں ہوتے ہیں، کبھی ان کے مقدسات کی پامالی انہیں سڑک پر لے آتی ہے، آخر اس کی اصل وجہ کیا ہے، غلطی کہاں ہو رہی ہے، مسلم یونیورسٹی ملت اسلامیہ ہندیہ کی پہچان اور ان کی زندگی کی علامت ہے، اس کو بھی ان سے چھیننے کی بار بار کوشش ہوتی رہتی ہے، اب تک اس کے متعلق مسلمان کوئی فیصلہ کن لائحہ عمل کیوں نہ تیار کر سکے اور جو کچھ مطالبہ حکومتوں کی خدمت میں پیش کیا اس کو تمام تر وفاداریوں کے بعد بھی مشرف قبولیت سے اس طرح نہیں نوازا گیا کہ مسائل کا سدباب ہو جائے، کیا اقبال نے سچ نہیں کہا تھا

ہند میں ملا کو جو ہے سجدے کی اجازت
نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

کیا مولانا آزاد نے اسی جانب اشارہ نہیں کیا، کیا ایسا نہیں ہوا کہ ہندوستان میں مسلم قیادت مفقود ہو کر رہ گئی، میں ہندوستان کے موجودہ تناظر میں ''اسلام کی سیاسی طاقت پر چھری'' کے بجائے مسلم سیاسی پر چھری چل جانے کی بات کر رہا ہوں، کیا سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی حالت ان مظلوم کسانوں کی سی نہیں جو بڑے بڑے زمینداروں کی استحصال ذہنیت کا شکار ہوتے رہتے ہیں، جن کا خون چوس کر رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں، مسلم یونیورسٹی ہے، تعلیمی ادارے ہیں، اور بہت سے کھانے کمانے والے ہیں، لیکن یہ کھانے کمانے والے کس کے ہیں، کس کے گن گاتے ہیں، کس نظام کا حصہ ہیں، یہ کس کے دست و بازو بنتے ہیں، یہاں سے پیدا ہونے والی سیاسی شخصیات نے قوم وملت کی سیاسی پشت پناہی کس حد تک کی ہے، ان کے سوچ کے زاویے کیا ہوتے ہیں، وہ مفادات سے کس قدر بلند ہوتے ہیں، کیا کبھی سوچا گیا کہ کانگریس اور علاقائی سیاسی جماعتوں کی ذہنی غلامی قوم کو کدھر لے جا رہی ہے، جب مسلم سیاسی طاقت پر اس ادارے نے غور نہیں کیا جس کو سب سے زیادہ حق تھا تو اب تعلیم و دولت سے مرتب طلائی بت بھی موجود ہیں اور بہشت شداد بھی۔ لیکن ذہنی غلامی کس کی ہو رہی ہے، صلاحیتوں سے فائدہ کون اٹھا رہا ہے، ترانے کس کے گائے جا رہے ہیں۔ ہم نے طلبہ کے درمیان رہ کر دیکھا ہے، ان سے گفتگو بھی کی ہے، کہ جو سیاست میں ذرا آگے قدم بڑھاتے ہیں انہیں یہ فکر لاحق ہوتا ہے کہ کسی طرح کوئی پارٹی غلامی کا سرٹیفکیٹ دے اور پھر قومی خدمت کا پرفریب نعرہ لے کر اور ملی کاز کا خوشنما بینر اٹھا کر پارٹی کی خدمت کی جائے اور اس طرح اپنے پیٹ کو موٹا کیا جائے، بسا اوقات اس ''بہشت'' کے ''حور و غلمان'' سے گفتگو کر کے جس طرح مایوسی ہوئی اس کو الفاظ کا جامہ دینا انتہائی مشکل کام ہے، لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس جہت سے چشم پوشی اور فکری غلامی کے سبب آج مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار داؤ پر لگا ہوا ہے، جس کا ایک سبب تو وہ نظام ہے جس کی بابت قرآن کا یہ تبصرہ صد فیصد صادق ہے ذلك مبلغهم من العلم (ان کے علم کی پہنچ یہیں تک ہے۔ (نجم ۳۰) اور اسی کے نتیجہ میں ملت اور ملی مفادات سے پیدا ہونے والی بیزاری ہے، حیرت ہے کہ لوگ سارے مسائل کا ٹھیکرا ایک وائس چانسلر پر پھوڑ دیتے ہیں، اگر وہ غلط ہے تو اسے غلط کہنا درست بھی ہے اور ضروری بھی، لیکن جس وقت اس کے انتخاب کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے، تو ابنائے قدیم سے لے کر اساتذہ فن تک سب مفادات کے بندے کیوں بن جاتے ہیں، اس وقت ملی شعور، اور مادر درسگاہ کے تئیں غیرت کہاں رخصت ہو جاتی ہے اور پھر اس جانب نظر کیوں نہیں جاتی کہ ہماری تمام تر کوششیں دفاع پر مبنی ہیں، ہندوستان کے تناظر میں ہم نے اپنی حفاظت کا کوئی سامان تیار نہیں کیا، جب سیاست میں ہماری مناسب حصہ داری نہیں، واقعی اسلامی شعور کے حامل مسلمان مقننہ کا حصہ نہیں، پارلیمنٹ میں ان کی کوئی نمائندگی نہیں تو پھر ہائے واویلا کے سوا ہمارا مقدر کیا ہوگا، اغیار اپنا کام کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے سوال اس کا ہے کہ ہم نے اب تک کیا کیا اور کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اگر ہندوستان کے منظر، اور پیش منظر پر نظر ہے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ مسلم غلبہ والی سیاسی طاقت کی تشکیل کی جائے اور اس پر مسلم سیاسی جماعت کا لیبل نہ چسپاں کیا جائے، سارے تجربات ہو چکے، اب اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں، ورنہ فریاد، مظاہرے اور چیخ پکار تو مغلوب قوموں اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والوں کا مقدر ہے ہی، ہم بھی اس کے عادی بن چکے ہیں، ہمارے چھوٹے چھوٹے مفادات اس سے آگے سوچنے پر بیڑیاں ڈال دیتے ہیں، نتیجہ سامنے ہے ہم جہاں سے چلے تھے آج بھی وہیں کھڑے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ گھڑی فیصلہ کی ہے، مدبرانہ حکمت اور جرأتمندانہ فیصلہ ہی ملت کے مقدر کو سنوار سکتا ہے ورنہ غلامانہ ذہنیت کے کرشمے ہم دیکھ رہے ہیں، مستقبل کی کربناکی کا انتظار اور ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

پیام سیرت

# جذبۂ محبت کے ساتھ ایمان وعمل صالح بھی ضروری ہے

محمد فرید حبیب ندوی
Email: 12fareedamu@gmail.com

**الحمد لله كفى وسلام على عباده الذين اصطفى!**

اے ابن عم ! تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

کبیدہ خاطر اور رنجیدہ دل ہونے کی بات نہیں۔

بھتیجے! اب تمہیں خوش ہو جانا چاہئے۔

اس گستاخ سے تمہاری طرف سے میں بدلہ لے چکا ہوں۔

جس نے تمہاری دل آزاری کی تھی..... تمہیں ستایا تھا۔

اور جس نے تمہارے خون کے قطرے گرائے تھے۔

میں نے اسے زخمی کر کے تمہارے قطروں کا حساب لے لیا ہے۔

میں نے تمہاری شادمانی کا سامان کر دیا ہے۔

چچا! میں انتقامی کاروائی سے خوش نہیں ہوا کرتا۔

اس سے میرے دل کو ٹھنڈک حاصل نہیں ہوتی۔

مجھے اس سے لذت کام ودہن نہیں نصیب ہوتی۔

دل کو چین، آنکھوں کو سرور اور طبیعت کو شادمانی نہیں ملتی۔

چچا! میں اپنی ذات کے لئے کسی پر انتقامی حملہ نہیں کرتا۔

چچا! آپ نے میری طرف سے بدلہ ضرور لے لیا۔

لیکن! میری خوشی، میری دل بستگی اور میری شادمانی اس میں نہیں!

میری تسکین قلب، میرا سرور اور میری فرحت ومسرت تو کسی اور چیز میں ہے۔

پیارے چچا! اگر آپ مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہیں!

اگر میرے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنے کی تمنا ہے!

مجھے احساس مسرت سے شادکام کرنا ہے۔

مجھے نشۂ خوشی سے مخمور کرنا ہے۔

تو.....اس کے لئے.....آپ کو.....ایک بڑی قربانی دینا ہوگی؟؟

اس کے لئے آپ کو.....اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر۔

اپنی خواہشات وجذبات کو دبا کر۔

مادیت کے پرفریب عفریت سے دامن بچا کر۔

بت پرستی کی گندگی اور دنیا کی تنگنائی سے نکل کر۔

میرے.....حلقہ.....میں .....داخل ہونا ہوگا۔

ایک اللہ کا اقرار.....اور.....میری رسالت پر ایمان لانا ہوگا۔

چچا! بس اسی میں میری خوشی ہے، یہی میری تمنا، اور یہی میری آرزو ہے۔

یہ گفتگو رسول پاک ﷺ اور آپ کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ میں اس وقت ہوئی جب ابو جہل نے آپ ﷺ کو سب وشتم کیا نیز آپ کو زخمی کر دیا۔ حضرت حمزہ کو..... جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے..... جب اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے بر سر محفل ابو جہل کو خوب کھری کھری سنائیں، اور اپنی کمان سے اس کے سر کو زخمی کر دیا، یہی خوشخبری دینے کے لئے آپ اپنے بھتیجے ﷺ کے پاس آئے تھے۔

یہ واقعہ موجودہ پس منظر میں ہمارے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اس میں پیغام ہے، .....نصیحت ہے..... درس عبرت ہے

.....اور.....لائحہ عمل ہے۔

کوئی گستاخ آپ ﷺ کی شان مبارک میں گستاخی کردے۔

کوئی بد بخت ناموس رسالت پر حملہ کر بیٹھے۔

کوئی آپ کی روح مبارک کو زخمی کرنے کی ناپاک جسارت کرے!

تو اس پر مسلمانوں کی طرف سے انتقامی کارروائی۔

جلسے جلوس اور احتجاجات و مظاہرے۔

یقیناً ضروری ہیں، مبارک ہیں، قابل ستائش اور لائق داد و تحسین ہیں۔

امت کی بیداری کی علامت اور رسول اللہ ﷺ سے اس کے لگاؤ کی دلیل ہیں۔

یہ اس بات کی پہچان اور عملی تصویر ہیں کہ یہ امت اس گئے گذرے دور میں بھی۔

بے عملی اور بد عملی کے اس زمانہ میں بھی۔

سب کچھ سہہ سکتی ہے، سب کچھ برداشت کرسکتی ہے۔

لیکن.....

اس کے رسول پر انگلی اٹھانا.....

آپ کی ذات والا صفات پر حملہ کرنا.....

بھڑ کے چھتے کو چھیڑنا اور سوتے شیر کو جگانا ہے۔

اس کے لئے یہ امت آج بھی کفن بدوش اور سر بکف ہو کر

اپنی متاع حیات کی قربانی کے لے ہمہ وقت تیار ہے۔

نہ صرف تیار..... بلکہ یہ اس کے خوابوں کی تعبیر اور اس کی آرزوؤں کی تکمیل ہے۔

لیکن: سوچنے کی بات یہ ہے کہ

کیا صرف اس جذبہ سے وہ اپنے رسول کو خوش کرسکتی ہے؟

کیا یہ انتقامی کارروائی اس کے محبوب کی شادمانی کا سبب بن سکتی ہے؟

مجھے آج بھی وہی نداء سنائی دے رہی ہے۔

جو آقائے دو جہاں نے ایسے ہی موقع پر اپنے چچا سے کہی تھی۔

اس کی بازگشت آج بھی کانوں سے ٹکرا رہی ہے۔

اور گویا آپ ﷺ آج بھی اپنے نام لیواؤں سے مخاطب ہو کر فرمارہے ہیں۔

میرے امتیو!!

تمہارا یہ جذبہ ہزار بار مبارک۔

تمہارا یہ انداز محبت سو بار قبول!

مگر میری خوشی صرف اس میں نہیں!!

صرف اس سے میری روح کو تسکین نہیں ملتی۔

اگر واقعی تم یہ سب کچھ میرے لئے..... مجھے خوش کرنے کے لئے ..... میری رضامندی کے لئے ..... اور ..... مجھے احساس خوشی سے نہال کرنے کے لئے کرتے ہو، تو.....

اپنی عملی زندگی سنوارو۔

منکرات و فواحش کی گرم بازاری کو روکو۔

عریانی و بے حیائی کے سیلاب پر بند باندھو۔

ترک فرائض اور ارتکاب کبائر کی روش سے باز آؤ۔

تعصب و نفرت کی دیواریں منہدم کرو۔

محتاجوں اور بے کسوں کی دستگیری کرو۔

تعلیم و تعلم کی فضا پیدا کرو۔

نفس اور شیطان کی بندگی سے آزاد ہو کر خدا کی بندگی کرنے لگو۔

اے ایمان والو! اللہ، اس کے رسول اور اس کتاب پر ایمان لے آؤ جو اس نے نازل کی ہے۔

اسی میں میری خوشی، اسی میں میری رضا اور اسی میں میرے قلب کی تسکین ہے۔

اگر تم یہ کرگذرو تو میرے دل کا چین اور آنکھوں کا سرور ہے۔

میں جو رحمت لے کر آیا ہوں تم اسے تقسیم کرنے والے بن جاؤ۔

اور یہ بات اپنی گرہ میں باندھ لو کہ

''جذبہ محبت کے ساتھ ایمان و عمل صالح بھی ضروری ہے''

☆☆☆

خصائص و امتیازات

( قسط–۱ )

# امت محمدیہ، خصوصیات وامتیازات

محمد قمر الزماں ندوی
جنرل سکریٹری: مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی، جھارکھنڈ
maeducationalsociety@gmail.com

**تمہید:۔**

انسانی زندگی کی طویل تاریخ میں انسانیت کی فلاح اور کامیابی کے لئے اللہ تعالیٰ نے مختلف علاقوں اور خطوں میں رسولوں اور نبیوں کو بھیجا تاکہ اس دنیا میں بسنے والے انسانوں کو ان کا صحیح مقام اور ذمہ داری یاد دلائیں اور وحی الٰہی اور انبیاء کی پاکیزہ تعلیمات کے ذریعہ وہ آخرت کی ابدی نعمتوں سے ہمکنار ہوں۔

انسانی زندگی کی اس طویل تاریخ میں اللہ تعالیٰ نے مختلف امتیں برپا کیں، وہ امتیں آئیں اور گزر گئیں، ان کے عروج وزوال اور ان امتوں کے مختلف واقعات کو قرآن حکیم کے اندر بطور تذکیر ذکر کیا گیا ہے، جن میں بنی نوع انساں کے لئے عبرت اور نصیحت کا سامان موجود ہے اور بطور خاص عقل مندوں کے لئے بڑی عبرت وموعظت پوشیدہ ہے۔

قرآن مجید میں جس قوم (امّت) کا تذکرہ سب سے زیادہ آیا ہے وہ قوم ''بنی اسرائیل'' ہے، اس قوم کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے دروازے کھول دئے تھے، ایک جگہ بنی اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا:

کہ ''اے اولاد یعقوب! میری جو نعمتیں تم پر ہوئی ہیں، ان کو یاد کرو کہ کیسے کیسے انعامات، عنایات، سلطنت وفوقیت تمہیں دی گئیں'' (سورہ بقرہ ۴۷)

لیکن بنی اسرائیل نے خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی ناقدری وناشکری کی، بالآخر اللہ کے غضب کی مستحق ٹھہری۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''وباء وا بغضب من اللّٰه'' اور وہ پلٹے اللہ کے غصہ کے ساتھ (سورہ بقرہ ۶۱)

ان تمام امتوں کے گزرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب اپنے آخری نبی پر آخری امت کے لئے اتاری، اللہ تعالیٰ نے اس امت کو خیر الامم بنایا اور اسے مختلف جہتوں اور پہلوؤں سے جو فضیلت وخصوصیت اور امتیازات واعزازات عطا فرمائے ہیں ان کا صحیح اندازہ ہم اسی وقت کر سکتے ہیں جب اس امت سے پہلے کی امتوں کا تقابلی مطالعہ کریں گے۔ اور پچھلی امتوں پر جس قسم کے سخت احکامات اور پابندیاں تھی ان کا گہرائی سے جائزہ لیں گے۔

سابقہ امتوں کے مقابلہ میں اس امت کو ''امت وسط'' بنایا

اس میں نہ دین موسوی کی طرح سختی رکھی گئی اور نہ ہی دین عیسوی کی طرح نرمی ، اور اس امت کو اللہ تعالیٰ نے مزید مختلف شرافتوں اور عنایتوں سے بہرہ ور کیا، ذیل کی تحریر میں ہم امت محمدیہ کی خصوصیات وامتیازات پر قرآن وحدیث کی روشنی میں سیر حاصل بحث کریں گے تاکہ ہم ناواقفوں کو اپنے مقام ومرتبہ کا احساس ہو اور ہم اپنے کریم اور شفیق آقا کے انعامات ونوازش اور عنایات پر جذبۂ تشکر بجالائیں۔

## امت محمدیہ کی پہلی خصوصیت أحکام شرعیہ میں نرمی وسہولت

اللہ تعالی نے اس امت کو خیر امت بنایا اور بہت سی ایسی خصوصیات سے نوازا جن سے دوسری امتیں محروم رہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے جن پاکیزہ صفات اور اوصاف کو قرآن مجید میں بیان کیا، ان میں ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ آپ ﷺ لوگوں کے لئے پاکیزہ اور پسندیدہ چیزوں کو حلال بتائیں گے اور گندی اور خبیث چیزوں کے حرام ہونے کو ظاہر کریں گے "ویحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث" (اور آپ ﷺ) پاک چیزوں کو ان کے لئے حلال بتاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں۔

اس آیت قرآنی سے مراد یہ ہے کہ بہت سی پاکیزہ نفیس اور پسندیدہ چیزیں جو بنی اسرائیل پر بطور سزا کے حرام کردی گئی تھیں آپؐ ان کی حرمت کو (اس امت کی آسانی کے لئے اللہ کے حکم سے) ختم کر دیں گے۔ مثال کے طور پر حلال جانوروں کی چربی جو بنی اسرائیل کی سرکشی کی سزا میں ان پر حرام کردی گئی تھی آنحضرت ﷺ اس کے حلال وجائز ہونے کا اعلان فرمائیں گے۔

مذکورہ آیت میں ہی آگے یہ صفت بھی بیان کی گئی کہ نبی کریم ﷺ لوگوں سے (امت محمدیہ سے) ان پر مسلط کردہ بوجھ اور قید کو ہٹادیں۔ یعنی آپؐ وہ سخت احکام اور دشوار گزار امور جو اصل دین میں مقصود نہ تھے بلکہ بنی اسرائیل پر بطور سزا کے لازم کردئے گئے تھے دور کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں اوصاف کو ذیل کی آیت میں بیان فرمایا ہے:

"ويحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث ويضع عنهم إصرهم والأغلال التى كانت عليهم"

آگے کے صفحات میں ہم تفصیل سے قرآن وسنت اور آثار صحابہ کی روشنی میں وہ سارے سخت اور مشکل ودشوار أحکام جو بنی اسرائیل پر بطور سزا لازم کردیئے گئے تھے بیان کریں گے اور پھر اس امت کو جو آسانی اور سہولت دی گئی اس کا بھی تذکرہ کریں گے کیونکہ چیزیں اپنے متضاد سے ہی پہچانی جاتی ہیں جیسا کہ مشہور قول ہے "الأشياء تعرف بأضداها"

### (۱) پانی سے پاکی حاصل کرنا:

سابقہ امتوں میں اور پہلی شریعتوں میں صرف پانی ہی سے پاکی حاصل کی جاسکتی تھی، دوسری چیزوں سے پاکی حاصل نہیں کی جاسکتی تھی۔ اگر پانی نہیں ملتا تو وہ نماز نہیں ادا کرتے، یہاں تک کہ پانی سے طہارت حاصل کرنے کے بعد فوت شدہ نمازوں کو ادا کرتے۔

اس امت کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ رخصت دی کہ پانی نہ رہنے کی صورت میں پاک مٹی سے بھی پاکی حاصل کی جاسکتی ہے، اور اس پاکی سے نماز ادا کی جاسکتی ہے، جس کو شریعت کی اصطلاح میں تیمّم کہا جاتا ہے، تیمّم یہ ہے کہ سطح زمین پر یا مٹی پر یا پتھر یا ریت جیسی کسی چیز پر یعنی جو ایسی چیزیں سطح زمین پر عموماً

ہوتی ہیں،ان میں سے کسی چیز پر طہارت کی نیت سے ہاتھ مار کر وہ ہاتھ چہرے اور ہاتھوں پر پھیر لئے جائیں، اس طرح بس ہاتھ پھیر لینے سے تیمم ہو جاتا ہے۔ مٹی وغیرہ کا چہرہ یا ہاتھوں پر لگنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کا اہتمام کرنا چاہئے کہ مٹی وغیرہ چہرا اور ہاتھوں پر نہ لگے۔

قرآن مجید میں سورہ نساء آیت نمبر۴۳ میں تیمم کی مشروعیت کو بیان کیا گیا ہے'' اور اگر تم بیمار ہو( اور پانی کا استعمال مضر ہو ) یا تم سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی استنجے سے آیا ہو یا تم نے بیویوں سے قربت کی ہو اور تم کو پانی نہ ملے۔تو تم پاک زمین سے تیمم کر لیا کرو (یعنی اس زمین پر دو ہاتھ مار کر)اپنے چہروں اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو، اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا اور بڑا بخشنے والا ہے''۔

یہی مضمون لفظوں کے بہت خفیف فرق کے ساتھ سورۂ مائدہ کے دوسرے رکوع میں بھی ارشاد فرمایا گیا ہے اور بعض راویوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر سورۂ مائدہ والی آیت نازل ہوئی تھی۔لیکن اکثر مفسرین کی تحقیق یہ ہے کہ سورۂ نساء والی آیت پہلے نازل ہوئی اور سورۂ مائدہ والی بعد میں۔(واللہ الم بالصواب)

تیمم کی مشروعیت کے سلسلے میں متعدد احادیث رسول وارد ہوئی ہیں جو صحاح ستہ کی کتابوں میں موجود ہیں، تفصیلات احادیث اور فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں، الغرض تیمم کا حکم ایک انعام ہے جو امت کی خصوصیت ہے۔اللہ تعالیٰ کا امت محمدیہ پر کتنا بڑا احسان ہے کہ وضو وطہارت کے لئے ایسی چیز کو پانی کا قائم مقام کر دیا جو پانی سے زیادہ سہل الحصول ہے، اور ظاہر ہے کہ زمین اور مٹی ہر جگہ موجود ہے، حدیث میں ہے کہ یہ سہولت صرف امت محمدیہ کو عطا کی گئی ہے۔(معارف الحدیث)

**(۲)عبادت گاہ ہی میں نماز کی ادائیگی:**

امم سابقہ کو مکلّف بنایا گیا تھا کہ وہ اپنی عبادتیں صرف اپنی عبادت گاہوں میں ہی ادا کر سکتے ہیں۔اگر عبادت کے اوقات میں اپنی عبادت گاہوں سے باہر ہوتے تو دوسری جگہوں پر نماز پڑھنے کی ان کو اجازت نہ تھی بلکہ حکم تھا کہ قضا عبادتیں بھی گرجا گھر میں ادا کرنی ہوتیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے پوری روئے زمین کی پاک جگہ پر نماز کی اجازت دے دی ہے۔چنانچہ بخاری شریف کی روایت ہے "أعطيت خمساً لم يعطهن احد قبلي .....وجعلت لي الأرض مسجداً وطهوراً "الخ (بخاری۳۳۵) تمام روئے زمین میرے لئے سجدہ گاہ اور مطہر بنا دی گئی یعنی میری امت کو ہر جگہ نماز پڑھنے کی اجازت ہے خواہ مسجد ہو یا غیر مسجد۔

**(۳)مال غنیمت کی حرمت:**

بنی اسرائیل میں مال غنیمت کے سلسلے میں شرعی حکم یہ تھا کہ جب کسی دشمن پر فتح اور کامیابی ہوتی اور مال غنیمت حاصل ہوتا تو اس میں تصرف کرنا جائز نہیں تھا۔بلکہ آسمان سے ایک آگ آتی اور اس کو جلا دیتی۔اسی کو غزوہ اور لڑائی کی قبولیت کی علامت سمجھی جاتی۔سورہ آل عمران آیت ۱۸۳ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے﴿الذين قالو إن الله عهد إلينا ألا نؤمن لرسول حتى يأتينا بقربان تأكله النار﴾(ال عمران۱۸۳)

وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم کو کہہ رکھا ہے کہ یقین نہ کریں کسی رسول کا جب تک نہ لاوے ہمارے پاس قربانی

کہ کھا جائے اس کو آگ تو کہہ تم میں آ چکے کتنے رسول مجھ سے پہلے نشانیاں لے کر اور یہ بھی جو تم نے کیا پھر ان کو کیوں قتل کیا تم نے اگر تم سچے ہو۔

اس آیت کریمہ میں بنی اسرائیل (یہودیوں) کا ایک افتراء وبہتان (جھوٹ) ذکر کیا گیا ہے وہ یہ کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کے لئے یہ حیلہ پیش کیا کہ سابقہ انبیاء علیہم السلام کے زمانوں میں یہ طریقہ تھا کہ صدقات کے مال کسی میدان یا پہاڑ پر رکھ دیئے جاتے تھے اور آسمانی آگ آ کر ان کو جلا دیتی تھی، یہی علامت صدقات کی قبولیت کی ہوتی تھی، رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کو حق تعالیٰ نے یہ خاص امتیاز عطا فرمایا کہ اموال صدقات آگ کی نذر کرنے کے بجائے مسلمان فقیروں ومحتاجوں کو دیئے جاتے ہیں۔ چونکہ پچھلے انبیاء کے طرز مذکور کے خلاف یہ طرز تھا، اس لئے اس کو مشرکین نے بہانہ بنایا کہ آگر آپ نبی ہوتے تو آپ کو بھی یہ معجزہ عطا ہوتا کہ آسمانی آگ اموال صدقات کو کھا جاتی، اس پر مزید یہ جرأت کی کہ اللہ تعالیٰ پر یہ بہتان باندھا کہ اس نے ہم سے یہ عہد لیا کہ ہم اس شخص پر ایمان نہ لائیں جس سے معجزۂ آسمانی آگ کے آنے اور مال صدقہ کو جلانے کا صادر نہ ہو۔

چونکہ یہود کا یہ دعوی بالکل بے دلیل اور باطل تھا کہ اللہ نے ان سے یہ عہد لیا ہے، اس کا جواب دینے کی تو ضرورت نہ تھی، ان کو ان ہی کے مسلمہ قول سے مغلوب کرنے کے لئے یہ ارشاد فرمایا کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے ایسا عہد لیا ہے، تو پھر جن انبیاء سابقین نے ہمارے کہنے کے مطابق یہ معجزہ بھی دکھلایا تھا کہ آسمانی آگ مال صدقہ کو کھا گئی تو تم ان پر تو ایمان لاتے، مگر ہوا یہ کہ تم نے ان کی بھی تکذیب ہی کی بلکہ ان کو قتل تک کر ڈالا۔

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اگر چہ یہود کا یہ مطالبہ اور دعوی قطعاً غلط تھا لیکن آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر یہ معجزہ بھی ہو جاتا تو شاید یہ ایمان لے آتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ یہ لوگ محض عناد اور ہٹ دھرمی سے یہ باتیں کہہ رہے ہیں اگر ان کے کہنے کے مطابق معجزہ بھی ہو جاتا، جب بھی یہ ایمان نہ لاتے۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے جو حکیم اور خبیر ہے اس نے اس امت کے لئے مالِ غنیمت کو حلال اور پاکیزہ کر دیا جیسا کہ قرآن اعلان کرتا ہے ﴿فکلوا مما غنمتم حلالاً طیباً﴾ (سورہ انفال آیت ۶۹) ''سو کھاؤ جو تم کو غنیمت میں ملا حلال ستھرا''

صحیح بخاری ومسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوئیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کفار سے حاصل ہونے والا مال غنیمت کسی کے لئے حلال نہیں تھا مگر میری امت کے لئے حلال کر دیا گیا۔ مال غنیمت کی حلت کا باقاعدہ حکم شرعی غزوہ بدر کے موقع پر دیا گیا۔

**(۴) بنی اسرائیل پر بعض پاکیزہ چیزوں کی حرمت:** اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر ان کی شرارتوں اور حیلہ بازیوں کی بناء پر بہت سی پاکیزہ اور حلال غذاؤں کو ان پر حرام کر دیا تھا۔

(الف) ہر ناخن والے جانور جن کے ناخن پھٹے ہوئے نہ ہوں، جیسے اونٹ، شتر مرغ اور بطخ وغیرہ یہ سب ان پر حرام کر دیئے گئے تھے۔

(ب) وہ چربی بھی حرام کر دی گئی تھی جو خالص چربی

کے ٹکڑے گائے بکری میں ہوتے ہیں، اور جو انتہائی لذید بھی ہوتے ہیں۔

سورۂ انعام آیت ۱۴۶ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے ﴿وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِبَغْيِهِمْ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ (اور یہودیوں پر ہم نے حرام کیا تھا ہر ایک ناخن والا جانور اور گائے اور بکری میں سے حرام کی تھی ان کی چربی مگر جو لگی ہو پشت پر یا ان کی انتڑیوں پر یا جو چربی کہ ملی ہوئی ہو ہڈی کے ساتھ یہ ہم نے ان کو سزا دی تھی ان کی شرارت پر اور ہم سچ کہتے ہیں)

مفسرین نے اس آیت کی تشریح میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شریعت محمدی اور یہودی فقہ کے درمیان حیوانی غذاؤں کی حلت وحرمت کے معاملہ میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ دو وجوہ پر مبنی ہے

ایک یہ کہ نزول توراۃ سے صدیوں پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام (اسرائیل) نے بعض چیزوں کا استعمال چھوڑ دیا تھا اور ان کے بعد ان کی اولاد بھی ان چیزوں کی تارک رہی، حتی کہ یہودی فقہاء نے ان کو باقاعدہ حرام سمجھ لیا اور ان کی حرمت توراۃ میں لکھ لی۔ ان اشیاء میں اونٹ اور خرگوش اور سافان شامل ہیں۔ آج بائیبل میں توراۃ کے جو اجزاء ہم کو ملتے ہیں ان میں ان تینوں چیزوں کی حرمت کا ذکر ہے۔ لیکن قرآن مجید میں یہودیوں کو چیلنج دیا گیا تھا کہ لاؤ توراۃ اور دکھاؤ یہ چیزیں کہاں حرام لکھی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ توراۃ میں ان احکام کا اضافہ اس کے بعد کیا گیا ہے، کیونکہ اگر اس وقت توراۃ میں یہ احکام موجود ہوتے تو بنی اسرائیل فوراً لا کر پیش کر دیتے۔

دوسرا فرق اس وجہ پر مبنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی شریعت سے جب یہودیوں نے بغاوت کی اور آپ اپنے شارع بن بیٹھے تو انہوں نے بہت سی پاک چیزوں کو اپنی موشگافیوں سے خود حرام کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر انھیں اس غلط فہمی میں مبتلا رہنے دیا۔ ان اشیاء میں ایک تو نوخن والے جانور ہیں یعنی شتر مرغ، قاز، بط، وغیرہ دوسرے گائے اور بکری کی چربی، بائیبل میں ان دونوں قسم کی حرمتوں کو احکام توراۃ میں داخل کر دیا گیا ہے، لیکن سورۂ نساء سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں توراۃ میں حرام نہ تھیں بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد حرام ہوئی ہیں، اس لئے بہت سے مفسرین اس بات کی تائید میں یہ کہتے ہیں کہ موجودہ یہودی شریعت کی تدوین دوسری صدی عیسوی کے آخر میں ربّی یہوداہ کے ہاتھوں مکمل ہوئی ہے اور تاریخ بھی اس کی شہادت دیتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ پھر ان چیزوں کے متعلق یہاں اور سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ نے حرمنا (ہم نے حرام کیا) کا لفظ کیوں استعمال کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدائی تحریر کی صرف یہی ایک ہی صورت نہیں ہے کہ وہ کسی پیغمبر اور کتاب کے زریعہ سے کسی چیز کو حرام کر دے، بلکہ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے باغی بندوں پر بنا وٹی شارعوں اور جعلی قانون سازوں کو مسلط کر دے اور وہ ان پر طیبات کو حرام کر دیں، پہلی قسم کی تحریم خدا کی طرف سے رحمت کے طور پر ہوتی ہے اور دوسری قسم کی تحریم اس کی پھٹکار اور سزا کی حیثیت سے ہوا کرتی ہے۔ (ملخص تفہیم القرآن جلد اول) (.....جاری)

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

# اپنی بیویوں کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آؤ!

مولانا ندیم احمد انصاری
(ڈیریکٹر الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن، انڈیا)

ایک بہت اہم مضمون، جس میں اکثر لوگوں سے کوتاہیاں ہوتی ہیں، خواہ عالم ہو یا جاہل، تاجر ہو یا کاشکار، متمدن ہو یا بدوی..... بیویوں کے حقوق کی پامالی ہے۔ اسلام میں عورت کا تصور خاندان کو تشکیل دینے والی شخصیت کی حیثیت سے ہے۔ بیوی ہی ہوتی ہے جو مکان کو گھر بناتی ہے۔ انگریزی میں اسے ''ہاؤس وائف (House wife)'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، لیکن صحیح طور پر اسے ''ہاؤس میکر (Home maker)'' کہنا چاہیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نکاح کے جو مہتم بالشان مقاصد بیان کیے ہیں، من جملہ ان کے جنسی اضطراب کی جگہ زوجین کے مابین پیار ومحبت، مودت والفت، دو خاندانوں کے درمیان ہمدردی اور خوش گوار تعلقات کی فضا کا قیام نیز بہ حیثیتِ والدین اولاد کے ساتھ مشفقانہ وجذباتی وابستگی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام امور اس ایک رشتۂ نکاح کے ذریعے ہی وجود میں آتے ہیں۔

ارشادِ ربانی ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ.(سورۃالروم: ۲۱)

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھارے واسطے تمھاری ہی جنس سے عورتیں پیدا کیں، تاکہ تم ان کی طرف مائل ہوکر سکون حاصل کرو اور تم میں الفت ومودت پیدا کر دی، جو لوگ غور کرتے ہیں، ان کے لیے ان باتوں میں بہت سی نشانیاں ہیں۔''

نکاح ایک نہایت پختہ عہد ہے، جس کے ذریعے اللہ تبارک وتعالیٰ نے زوجین کے درمیان ارتباط پیدا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نکاح کے بعد فریقین میں سے ہر فرد کو ''زوج'' کہا جاتا ہے، چوں کہ ہر ایک دوسرے کا جوڑ ہوتا ہے۔ باری تعالیٰ نے اسی امر کی پُرحکمت تصویر کشی اس طرح کی ہے:

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾(سورۃ البقرۃ:۱۸۷)

''وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔''

اس میں لطیف اشارہ اس طرف ہے کہ زوجین کو باہم الفت ومحبت کے ساتھ اور ایک دوسرے کے لیے ستر پوشی کا ذریعہ بن کر رہنا چاہیے۔ لباس کے مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے ذریعے پردہ حاصل ہوتا ہے، اسی طرح میاں بیوی کو بھی ایک دوسرے کی عیب پوشی کا معاملہ کرنا

چاہیے۔لباس کا ایک مقصد زینت حاصل کرنا بھی ہے،اس سے معلوم ہوا کہ میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لیے باعثِ زینت ہونا چاہیے، چوں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہوتے ہیں۔میاں بیوی کے تعلق کے یہ دو فائدے نہایت اہم ہیں، اگر بیوی نہ ہو تو شوہر اپنے جنسی تقاضوں کی تکمیل کے لیے نہ جانے کہاں کہاں منہ مارتا پھرے۔اس آیت سے ایک بات اور سمجھی جاسکتی ہے کہ جس طرح لباس انسان کے جسم کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے، اسی طرح انسانی زندگی میں میاں بیوی ایک دوسرے کے قریب ترین ہوتے ہیں۔(انظر حقوق العباد: ۵۲)

شوہر وبیوی، دونوں کے حقوق مساوی ہیں، بجز ان چند باتوں کے جو مَردوں کے ساتھ ان کی فطرت کے لحاظ سے مختلف ہیں۔

ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ، وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾.(سورة البقرة:۲۲۸)

عورتوں کا حق مَردوں پر ویسا ہی ہے، جیسے دستور کے موافق مَردوں کا حق عورتوں پر ہے، البتہ مَردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت ہے۔

خیال رہے! اس فضیلت کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ عورت، مرد کی غلام ہے، شوہر جو چاہے اس کے ساتھ سلوک کرے، بلکہ عورت کے بالمقابل مرد پر زیادہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ عورت کے حقوق کا لحاظ رکھے۔

ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ، فَإِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾(سورة النساء: ۱۹)

مومنو! (اپنی) بیویوں کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آؤ۔اگر وہ تمھیں (کسی معاملے میں) ناپسند ہوں، (تو) عجب نہیں کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس میں بہت سی بھلائی رکھ دی ہو۔

یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے واضح ہدایت فرمادی کہ بیوی کے حقوق، کشادہ دلی سے ادا کرتے رہنا اور ہر معاملے میں ان کے ساتھ احسان وایثار کی روِش اختیار کیے رہنا۔مقامِ غور ہے کہ اگر کسی پولس افسر کی بیٹی سے جب کوئی آدمی نکاح کرے اور وہ افسر اپنے داماد کو کہے کہ میری بیٹی کو ستانا مت، ورنہ میں تمھاری پکڑ کروں گا، تو وہ داماد کس حد تک سنبھل کر اپنی بیوی سے معاملہ کرے گا، لیکن یہاں تمام کائنات کا مالک کہہ رہا ہے کہ میری اس مخلوق کے ساتھ خصوصی احسان مندی کا معاملہ کرنا، اس کے باوجود انسان پروا نہیں کرتا! شوہر کو جب اللہ نے کچھ فضیلت عنایت فرمائی ہے تو اسے بھی وسیع الظرفی کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور چھوٹی موٹی غلطیوں سے درگزر کرتے رہنا چاہیے، اس طرح بیوی اور بچوں میں اعتماد اور محبت کا اضافہ ہوتا ہے۔

حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''عورتیں، شریف شوہروں پر غالب آجاتی ہیں اور کمینے شوہر بیویوں پر غالب آجاتے ہیں، میں پسند کرتا ہوں کہ شریف وکریم رہوں (چاہے) مغلوب رہوں اور میں اسے پسند نہیں کرتا کہ کمینہ اور بد اخلاق ہوکر ان پر غالب آجاؤں۔''(روح المعانی: ۱۴/۵)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں

:"جو اپنی بیویوں کو ستائے، ان سے اچھے اخلاق سے پیش نہ آئے اور اللہ تعالیٰ کی سفارش کو رد کردے، وہ بے غیرت مرد ہے، کیوں کہ وہ (عورت) کمزور ہے، تمھارے قبضہ میں ہے، اس کے باپ اور بھائی دور ہیں۔"

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

**خیر کم خیر کم لأهله وأنا خیر کم لأهلی.** (ترمذی: ۳۸۹۵، السنن الکبریٰ للبیهقی: ۷/۴۷۸)

تم میں سب سے بہتر شخص وہ ہے، جو اپنی بیوی سے اچھا سلوک کرتا ہو اور میں تم سب سے زیادہ اپنی بیویوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہوں۔

نیز آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

**أکمل المؤمنین ایماناً أحسنهم خلقاً، خیارکم خیارکم لنسائهم.** (ترمذی: ۱۱۶۲)

مومنوں میں سب سے کامل ایمان والا وہ ہے، جو اخلاق میں بہتر ہو اور تم میں بہتر لوگ وہ ہیں، جو اپنی بیویوں کے لیے بہتر ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر بیویوں کے حقوق کی تاکید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

**الا واستوصوا بالنساء خیرا فانما هن عوان عندکم لیس تملکون منهن شیئاً غیر ذلک الا أن یأتین بفاحشة مبینة فان فعلن فاهجروهن فی المضاجع واضربوهن ضرباً غیر مبرح فان أطعنکم فلا تبغوا علیهن سبیلاً الحدیث.** (ترمذی: ۱۱۶۳)

خبردار! میں تمھیں عورتوں کے حق میں بھلائی کی نصیحت کرتا ہوں، اس لیے کہ وہ تمھارے پاس قید ہیں (خیال رہے قیدی ہیں، یہ ارشاد نہیں فرمایا) اور تم ان پر اس کے علاوہ کوئی اختیار نہیں رکھتے کہ ان سے صحبت کرو، البتہ اگر وہ کھلم کھلا کسی گناہ کی مرتکب ہوں، تو انھیں اپنے بستر سے الگ کر دو اور (ضرورت پڑنے پر) ان کی معمولی پٹائی کرو، پھر اگر وہ تمھاری (صحیح) بات ماننے لگیں تو انھیں تکلیف پہنچانے کے راستے تلاش مت کرو، الخ۔

ایک حدیث میں آیا ہے:

**قال رسول اللّٰه ﷺ المرأة وبعلها شاهد الاباذنه، ولا تأذن فی بیته وهوشاهد الا باذنه، وما أنفقت من کسبه عن غیر أمره، فان نصف أجره له.** (مسند احمد ابن حنبل: ۸۱۷۳)

اگر عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں سے کچھ، اللہ کے نام پر خرچ کر دے، تو یہ خرچ کرنا اس کے لیے جائز ہے اور اس کا نصف ثواب اس کے شوہر کو بھی ملے گا۔

ان احادیث سے شوہر کے مال میں عورت کا حق واختیار دونوں ثابت ہوتے ہیں۔

نیز رسول اللہ ﷺ نے شوہر کو اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

**اذاأنفق الرجل علی اهله نفقة، وهو یحتسبها کانت له صدقة.** (بخاری: ۵۵، مسلم: ۱۰۰۲، ترمذی: ۱۹۶۵)

جب کوئی آدمی اپنے اہل وعیال پر اللہ کا حکم پورا کرنے کی نیت سے خرچ کرتا ہے، تو اس کو اس پر صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے، حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

**عن النبی ﷺ قال: أول ما یوضع فی میزان العبد نفقة علی أهله.** (الترغیب

والترهيب:۲۹۲۷)

جو چیز قیامت میں بندے کے اعمال تولنے کے وقت ترازو میں سب سے پہلے رکھی جائے گی؛ وہ اس کا اپنے اہل و عیال پر کیا ہوا خرچ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے عدل و انصاف قائم کرتے ہوئے ارشادفرمایا:عن النبی ﷺ قال: سأله رجل؛ ما حق المرأة على الزوج؟ قال: تطعمها اذا طعمت، و تكسوها اذا اكتسبت، ولا تضرب الوجه، ولا تقبح، ولا تهجر الا في البيت. (مسند احمد ابن حنبل:۲۰۲۶۲)

شوہر کے ذمے عورت کے یہ حقوق ہیں کہ جو خود کھائے وہی اپنی بیوی کو کھلائے،اپنے لیے کپڑے بنائے تو اس کے لیے بھی بنائے،اس کے چہرے پر نہ مارے،اسے بُرا بھلا نہ کہے اور اسے بلاوجہ کہیں اکیلا نہ چھوڑ دے،مگر گھر میں۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا:

لايفرک مؤمن مؤمنة ان کره منها خلقا رضی منها آخر. (مسلم: ۱۴۶۷)

کوئی ایمان والا مرد کسی ایمان والی عورت کو دشمن نہ رکھے،اس لیے کہ اگر اس میں کوئی عادت ناپسندیدہ ہے تو کوئی عادت پسندیدہ بھی ضرور ہوگی۔

ایک مرتبہ ایک صحابی اپنے غلام کی پٹائی کر رہے تھے،حضور ﷺ نے انھیں دیکھا تو ارشادفرمایا:

تجھے جتنی طاقت اس غلام پر ہے،اس سے زیادہ طاقت اللہ تعالیٰ کو تجھ پر ہے۔صحابیؓ کہتے ہیں کہ میں نے مڑ کر دیکھا،تو آپ ﷺ تھے۔

میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں اس غلام کو اللہ تعالیٰ کے لیے آزاد کرتا ہوں۔

آپ ﷺ نے ارشادفرمایا:اگر تم ایسا نہ کرتے،تو تمھیں جہنم کی آگ لپیٹ لیتی۔(مسلم: ۲/ ۵۱)

ایک موقع پر حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا:اللہ سے دو کمزوروں کے بارے میں ڈرتے رہو۔(۱)غلام اور(۲)عورت۔(الجامع الصغير للطبراني:۱۲۶)

اس قدر واضح ہدایات کے باوجود بہت سے شوہر اپنی بیویوں پر یہ کہہ کر دھاک جماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا ہے کہ اگر میں خدا کے بعد کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو ایک بیوی کو یہ حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا:لو كنت آمراً أحداً أن يسجد لأحد، لأمرت المرأة أن تسجد لزوجها.(ترمذی: ۱۱۵۹)

اگر میں کسی کو اللہ کے سوا سجدہ کا حکم دیتا تو بیوی کو یہ حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ ''اگر حکم دیتا تو''یعنی اللہ کے رسول ﷺ نے حکم دیا نہیں اور یہ حکم خاص اللہ کی ذات کے لیے محفوظ ہے کہ اسی ذات وحدہ لاشریک کو سجدہ کیا جائے۔دوسری بات اس سے یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگر کسی چیز میں شوہر کا حکم ماننے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ کسی چیز کا ارتکاب کرنا پڑے،تو اسے ہرگز نہیں مانا جائیگا،اسی لیے حضرت نبی کریم ﷺ نے عورت کو یہ حکم نہیں دیا،لیکن ہمارے معاشرے میں ہر وقت کا مشاہدہ یہ ہے کہ کسی مرد کو نکاح اور ازدواجی زندگی سے متعلق کوئی بات اور مسئلہ معلوم ہو یا نہ ہو،مذکورہ حدیث ہر ایک کی زبان پر رہتی ہے اور اس ایک حدیث کے علاوہ اس

سلسلہ کی جو احادیث کثرت سے وارد ہوئی ہیں، عموماً ان کی طرف نظرِ التفات نہیں کی جاتی، یہی وجہ ہے کہ ہمارا گھر ہر وقت لڑائی، جھگڑوں اور ناچاکی سے اٹا رہتا ہے۔

بعض لوگ ذرا ذرا سی بات پر اپنی بیویوں پر ہاتھ اٹھانا اپنا حق سمجھتے ہیں، جب کہ حضرت نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

**لا یجلد أحدکم امرأة جلد العبدثم یجامعها فی آخر الیوم.** (بخاری: ۵۲۰۴، مسلم: ۲۸۵۵)

تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کو نوکروں کی طرح نہ مارے، افسوس ہے اس شخص پر جو ایک وقت میں تو اپنی بیوی کو اس طرح مارے اور دوسرے وقت میں اس سے اپنی ضرورت پوری کرے۔

یہ تو سوچیے کہ آخر وہ بھی انسان ہی ہے اور انسانی مزاج آپس میں کچھ نہ کچھ تو مختلف ہوتے ہی ہیں، پھر کیسے ممکن ہے کہ اس کی ہر بات آپ کے مزاج کے موافق ہو؟ اس کے باوجود رحمۃ للعالمین ﷺ کا طرزِ عمل دیکھیے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: **مایضرب رسول اللّٰہ ﷺ شیئاً قط بیدہ ولا امرأة، ولا خادماً، الا أن یجاهد فی سبیل اللّٰہ الخ.** (مسلم: ۲۳۲۸)

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے کبھی کسی کو نہیں مارا، سوائے اللہ کے راستے میں جہاد کے وقت۔ آپ نے کبھی کسی غلام کو مارا نہ کسی بیوی کو۔

رسول اللہ ﷺ نے تو ایک دوسرے کے ساتھ پیار و محبت کی تعلیم دی ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **انک لن تنفق نفقة تبتغی بها وجه اللّٰہ الا أجرک علیها حتی ما تجعل فی فم امرأتک.** (بخاری: ۵۶، دارمی: ۳۰۶۵، ترمذی: ۲۴۴۵)

کھانے کا وہ لقمہ، جو کوئی شوہر محبت کے ساتھ اپنی بیوی کے منہ میں رکھے، وہ بھی صدقہ (کا ثواب رکھتا) ہے۔

بعض شوہر اپنی بیویوں کو گالیاں دیتے ہیں، اس سے ممانعت پر ایک صریح حدیث تو اوپر گذر چکی، مطلق گالی گلوچ کے متعلق ارشادِ نبوی ہے: **سباب المسلم فسوق، وقتاله کفر.** (بخاری: ۴۸، مسلم: ۶۴)

کسی بھی مسلمان کو گالی دینا فسق اور اسے قتل کر ڈالنا کفر ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہیے کہ بیوی کے شوہر پر یہ چند حقوق ہیں:

(۱) اپنی حیثیت کے مطابق اس کا نان و نفقہ ادا کرتا رہے۔

(۲) اس کے رہنے کا مناسب انتظام کرے۔

(۳) اس کا مہر ادا کرے۔

نیز بیوی کے ساتھ حسنِ معاشرت کے مندرجہ ذیل آداب ہیں:

(۱) نکاح کے بعد ولیمہ کرے۔

(۲) بیوی کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئے اور حسنِ اخلاق میں صرف یہی داخل نہیں کہ اس کو تکلیف نہ دے، بلکہ اس کی طرف سے دی جانے والی تکالیف کو بھی حتی الامکان برداشت کرتا رہے۔

(۳) اس کے ساتھ حسبِ موقع جائز مذاق اور دل خوش کُن باتیں بھی کرتا رہے۔

(۴) بیوی کے ساتھ اس قدر ملاعبت بھی نہ کرے کہ اس کے اخلاق خراب ہو جائیں۔

(۵) غیرت اور شرم کی باتوں میں اعتدال سے کام لے، لیکن زیادہ بدظنی سے بھی کام نہ لے۔

(۶) بیوی کے نان نفقہ میں اعتدال قائم رکھے، نہ بہت تنگی کرے اور نہ فضول خرچی اور ایسا نہ کرے کہ خود عمدہ چیزیں کھائے اور گھر والوں کو نہ کھلائے..... اس طرزِ عمل سے دلوں

میں کدورت اور کینہ پیدا ہوتا ہے۔

(۷) بیوی کو ضروری دینی مسائل سکھلائے اور گھر کے کاموں کے ساتھ انھیں دینی فرائض وواجبات کے ادا کرنے کا موقع بھی دے۔

آج ہم نے عورتوں کے دین کی طرف سے اس قدر غفلت اختیار کر رکھی ہے، گویا کہ وہ حیوان ہوں، جن پر شریعت واجب ہی نہیں، جس کا خمیازہ دنیا میں بھی بھگتنا پڑتا ہے قیامت میں تو مستقل اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔

(۸) اگر ایک سے زیادہ بیویاں ہوں، تو اُن کو کھلانے پلانے اور وقت گزاری وغیرہ دینے میں برابری کا معاملہ کرے۔

(۹) اگر بیوی سے واقعی ایسی نافرمانی صادر ہو، جس پر تنبیہ کرنا شریعت نے جائز قرار دیا ہے، تو اول اس کو نرمی سے سمجھائے اور ڈرائے، اگر اس پر بھی نہ مانے تو سونے میں اس سے اپنی پشت پھیرے یا بستر میں علاحدگی اختیار کرے، اگر اب بھی درست نہ ہو، تو پھر مناسب مار اللہ سے ڈرتے ہوئے اس کی اصلاح کی نیت سے اس طرح مارے کہ جس سے اس کو تکلیف تو ہو، لیکن کوئی ہڈی نہ ٹوٹے اور خون نہ نکلے نیز چہرہ پر ہرگز نہ مارے۔ یہ بھی خیال رہے کہ جن باتوں پر سزا دینا جائز ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی دیندار عالم کے سامنے پورا مسئلہ رکھ کر شرعی حکم معلوم کیا جائے، اتفاقی غلطیاں جو اکثر انسان ہونے کے ناطے ہوتی رہتی ہیں، ان پر بلا شرعی جواز کے سزا دینا ہرگز جائز نہیں۔ خیال رہے قادرِ مطلق کو بھی منہ دکھانا ہے، وہاں ہر چھوٹی بڑی بات کا حساب ہوگا۔

(۱۰) لڑکی کے پیدا ہونے پر کسی قسم کا رنج وملال نہ اپنے دل میں محسوس کرے اور نہ بیوی پر ظاہر کرے۔ (مستفاد

از خطباتِ موعظت: ۳۲۳-۳۲۶ بتصرف)

آج معاشرے میں ہر فرد کی طرف سے دوسرے کے حقوق ادا کرنے میں چوں کہ بہت سی کوتاہیاں ہو رہی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ غیر یہ کہتے ہیں کہ ''اسلام میں عورت کو حقوق سے محروم رکھا گیا۔'' یہ ہمارے لیے بڑے ہی خسارے کی بات ہے کہ ہمارے ذاتی اعمالِ بد کی وجہ سے اسلام جیسے مقدس دین پر بٹّا لگے۔

برادرانِ اسلام! عورت و بیوی کا مسئلہ انتہائی نازک ترین اور اہم ہے، اس پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہماری بے التفاتی اور کوتاہیوں کی وجہ سے آج دشمنانِ اسلام بڑی چالاکی سے اسلام پر اعتراض کرتے ہیں اور اسلامی نظریات کے سلسلے میں لوگوں کے دل ودماغ میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے احتیاط وحقیقت پسندی کا مظاہر کرتے ہوئے اسلام اور تعلیماتِ اسلام دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

اصل بات جو یاد رکھنے کی ہے وہ یہ کہ عورت بھی مرد ہی کی طرح اللہ کی بنائی ہوئی ایک مخلوق ہے نہ کہ محض مرد کی خدمت کرنے والی کوئی مشین۔ اگر اس کے ان حقوق کو اعتدال کے ساتھ ادا کیا جائے تو یہ ازدواجی زندگی بہت ہی خوشی اور مسرت کے ساتھ بتائی جاسکتی ہے، ورنہ تو ڈر ہے کہ بیوی کی حق تلفی کرنے والا شوہر دنیا میں قانون اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے حضور رسوا ہو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی کامل زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور ہمیں دنیا اور آخرت کی ذلت ورسوائی سے بچائے۔ آمین یا رب العالمین

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

# بے حجابی کا نتیجہ

## (''یوم حجاب'' کے موقع پر پیش کردہ تقریر کا خلاصہ)

غزالہ پروین

دنیا میں انقلابات پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ قوموں کی تعمیر و تخریب میں ''عورت'' کا مقام کیا ہے۔ جب کبھی کسی ملک میں صنف نازک بے حیائی، عریانی اور آزادی کی راہ پر چل نکلتی ہے تو اس ملک کا انجام تباہی کے سوا اور کچھ نہیں بچتا۔ اس لیے اسلام جو دین فطرت ہے مرد کے ساتھ ساتھ عورت کی اصلاح پر بھی یکساں زور دیتا ہے۔ جس میں ''پردہ'' ایک اہم کڑی ہے۔ اس وجہ سے کم و بیش ہر دین دھرم نے دونوں کے آزادانہ میل جول اور خلا ملا سے منع کیا ہے لیکن انسان جانوروں سے ایک الگ مخلوق ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں کے ذریعہ عورت اور مرد کے تعلقات کو جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی اصطلاحوں میں بتایا ہے تاکہ انسان کی انفرادی، خاندانی اور سماجی زندگی پاکیزہ اور اخلاق مندرہ سکے۔

پردے کے احکام جو اسلام نے دیے ہیں ان پر تھوڑا سا بھی غور کیجئے تو سمجھ میں آسکتا ہے کہ انکے تین بڑے مقاصد ہیں۔

(ا) اول یہ کہ عورتوں اور مردوں کے اخلاق کی حفاظت کی جائے اور ان خرابیوں کا دروازہ بند کیا جائے جو مخلوط سوسائٹی میں عورتوں اور مردوں کے آزادانہ میل جول سے پیدا ہوتی ہے۔ حقوق انسانی (Human Rights)، آزادی نسواں اور تحریک نسواں کے ذریعہ مغربی نظریہ سازوں نے عورتوں کو حق دینے سے زیادہ حق کی آڑ میں عیش پرستی کے لیے عورتوں کو سر بازار کھینچ لیا۔ جس کے نتیجے میں وہ خاتون خانہ نہیں سبھا کی پری بن کر رہ گئیں۔ حدیث نبوی میں ارشاد ہے:

''ہر دین کا ایک اخلاق ہوتا ہے اور اسلام کا اخلاق حیا ہے''۔

''اور جب تجھ میں حیا نہیں تو جو تیرا جی چاہے کرے''۔

نتیجہ یہ ہوا کہ بے حیائی، عیاشی اور عریانیت کا بازار تو ایک طرف گرم ہوا ہی دوسری طرف عورتوں کے حقوق اور اختیار و اقتدار میں سا جھے داری کے نام پر اسے بازاری اشتہار اور بکاؤ مال بنا دیا گیا۔

مخلوط سوسائٹی میں جہاں بن سنور کر عورتیں آزادانہ پھریں اور زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے ساتھ کام کریں وہاں اخلاق بگڑنے سے کیسے بچ سکتا ہے۔ جنسی جرائم بڑھتے جارہے ہیں۔ جنسی آوارگی کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اب اس کے کھلے لائیسنس سے بھی دل نہیں بھر رہے ہیں۔ ایسے ایسے طریقے ایسی ایسی حرکتیں اختیار کیے گئے ہیں جس میں ملحدانہ اور آزاد مزاج خواتین کی بھی مٹی پلید ہو کر رہ گئی ہے۔ ذیل میں چند عبرت انگیز نتائج درج کیے جارہے ہیں:

(الف) مغربی نظریہ سازوں اور عیاشوں نے Girl Friend اور Boy Friend سے آگے بڑھ کر بغیر نکاح کے آزاد جنسی رابطہ کو جائز قرار دیا۔ یعنی (Pre-marital sexual relation, Permessivness)۔

(ب) بغیر نکاح کے ایک ساتھ زندگی گذارنا (Live in Relationship)۔ بعض مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کے سپریم کورٹ نے 23 مارچ 2010ء کو نکاح سے پہلے جنسی تعلق کی حمایت کردی۔

(ج) بعض مغربی ملکوں اور شہروں کی نقل میں حجاب دشمنوں نے Gay Marriage یا (Homo Sexuality)۔ بالفاظ دیگر مرد کا مرد سے شادی کرنا اور عورت کا عورت سے جنسی تسکین بہم پہنچانا جائز قرار دے دیا۔ غرض آج پورے ہندوستان

میں ہم جنس پرستوں (Lesbian) کی تعداد 25 لاکھ سے بھی زاید ہوچکی ہے۔

(د) ان حرکتوں نے معاملہ قائم مقام مادریت یا (Surrogate mother hood) تک پہنچادیا۔

(ہ) مادہ منویہ (Sprum bank) کی دکانیں کھول دی گئیں۔

(و) عیش پرستوں نے حمل ضائع کرنے (Foeticide) یا جنین کشی کی قانونی اجازت حاصل کرلی۔

(ز) جسم فروشی کو ایک سند بنا کر اس میں ملوث لوگوں کو Sex worker کہا جانے لگا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ حجاب کے خلاف محاذ آرائی کرکے دنیا نے عیاشی کو اس طرح فروغ دیا کہ انسانیت مسخ ہوکر رہ گئی اور عصر حاضر کی معلومات زدہ تہذیب نے عربوں کی جاہلیت کو بھی مات کردیا۔

قرآن میں سورۃ الاعراف آیت ۳۲ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب نے حرام کیا ہے بے شرمی کے کام خواہ کھلے ہوں یا چھپے اور حق کے خلاف زیادتی''۔

(۲) پردے کا دوسرا بڑا مقصد یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کا دائرہ عمل الگ کیا جائے۔ ان دونوں کا دائرہ عمل الگ کرنا خود فطرت کا تقاضا ہے۔ دونوں کی نفسیات، جسمانی ساخت اور احساسات و جذبات میں بنیادی فرق ہے۔ اس فرق اور امتیاز کی باریکی کو خدا سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے۔ فطرت نے ماں بننے کی خدمت عورت کے سپرد کرکے اسکی اصلی جگہ بتادی تو باپ بننے کا فرض مرد کے ذمہ ڈال کر خود اشارہ کردیا ہے کہ اسے کن کاموں کے لیے مادری بوجھ سے سبکدوش کیا گیا ہے۔

اب اگر مغربی نظریہ ساز اس تقسیم کو مٹانا چاہتے ہیں تو پھر فیصلہ کرلینا ہوگا کہ دنیا کو اب ماؤں کی ضرورت نہیں۔ ذرا بھی وقت نہیں گذرے گا کہ انسان ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے بغیر ہی ختم ہوجائے گا۔ ٹھنڈے دل سے سوچنے کی بات یہ ہے کہ انسانیت کی خدمت میں آدھا حصہ تو وہ ہے جسے پورے کا پورا عورت سنبھالتی ہے۔ کوئی مرد اس میں ذرہ برابر بھی اسکا بوجھ نہیں بٹا سکتا۔ باقی آدھے میں سے آدھا بار بے چاری عورت اٹھائے کیا یہ انصاف ہے۔ عورت اس ظلم کو خوشی خوشی برداشت کرنے کے لیے اس لیے مجبور ہوئی کہ اسے مغربی تہذیب نے عورت ہوتے ہوئے اور عورت کی جگہ کام کرتے ہوئے اسے عزت دینے سے انکار کیا۔ بچوں والی کہہ کر اسکا مذاق اڑایا۔ گھر گرہستن کو ذلیل قرار دیا۔

اسلام نے اس پر یہ مہربانی کی کہ عورت رہتے ہوئے اسے پوری عزت مرد کے برابر بلکہ ماں ہونے کی حیثیت سے مرد سے کچھ بڑھ کر دی۔ اور حجاب کے ذریعہ اس کی عزت و ناموس کی حفاظت کا ٹھوس انتظام کیا۔

(۳) تیسرا مقصد پردے کا گھر اور خاندان کے نظام کو محفوظ اور مضبوط بنانا ہے۔ پردے کے بغیر جن لوگوں نے گھر اور خاندان کے نظام کو محفوظ کیا ہے۔ انہوں نے عورت کو غلام بنا کر انہیں تمام حقوق سے محروم کردیا۔ اور جنہوں نے عورت کو اس کے حقوق دینے کے ساتھ پردے کی پابندیاں بھی نہیں رکھی ہیں انکے یہاں گھر اور خاندان کا نظام بکھر گیا اور روز بروز بکھرتا چلا جارہا ہے۔

گھر اور خاندان جن کی اہمیت ہم ترقی کے جوش میں بھول گئے ہیں دراصل وہ کارخانے ہیں جہاں انسان تیار کیے جاتے ہیں۔ اور ان کارخانوں کو چلانے کے لیے جن صفات، نفسیات، قابلیت، محنت و مشقت اور فرض شناسی کی ضرورت ہوتی ہے فطرت نے سب سے بڑھ کر عورت کو دی ہے۔ ان کارخانوں کو سکون و اطمینان اور اعتماد کے ساتھ چلانے کے لیے اسلام نے پردے کا ڈسپلن قائم کیا تاکہ عورت پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ اپنا کام کرسکے۔ اور غلط سمت کی طرف اسکی توجہ نہ بٹے۔ مگر مغربی تہذیب کی اندھی تقلید میں ہم ترقی کی خاطر اس ڈسپلن کو ختم کردینا چاہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اپنے ملک کے علاوہ مغربی ملکوں میں بھی جو تعلیم یافتہ لڑکے، لڑکیاں اور عورتیں پردہ کی اہمیت اور حقیقت کو سمجھ لیتی ہیں تو کھلے دل سے اسلام قبول کرلیتی ہیں۔ چنانچہ دنیا میں قبول اسلام کی جو لہر چل رہی ہے اس میں عورتوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ جب کہ پردے کے خلاف پروپیگنڈہ بھی سب سے زیادہ ہے۔ یہ اسلام کے دین فطرت ہونے کا واضح ثبوت ہے۔

ضرورت اسی بات کی ہے کہ مسلم لڑکیاں اور عورتیں پردے کی حکمت، مصلحت اور حقیقت و اہمیت کو سمجھیں اور ان پر عمل پیرا ہوں۔

☆☆☆

# علم، مقاصد و فوائد

ابوطلحہ ندوی

ہر چیز کا ایک ستون ہوتا ہے اور اس دین کا ستون علم ہے، علم وہ روشنی ہے جو گم گشتگان راہ کو راہ راست پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے، علم کا رفیق، خلوت کا ہم نشین اور ترقی کی راہوں پر گامزن کرنے والا ایک عظیم رہبر اور عمدہ رہنما ہے، جو صاحب علم کو وحشت، زوال اور انحطاط کے عمیق غار میں گرنے سے بچاتا ہے۔

علم اللہ کی صفت ہے۔ علم کو پھیلانا گویا بندہ کو خدا سے وابستہ کرنا ہے، نبی کریم ﷺ کو ہزاروں معجزے ملے لیکن سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے جو علمی معجزہ ہے۔

اور علم حقیقی اس علم کو کہتے ہیں جس سے بندہ اپنے رب اور نفس کو پہچان لے اور اس خطرے کا ادراک کرے جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت آنے والا ہے، جس شخص کو علم حقیقی حاصل ہوتا ہے اس میں کبر نہیں ہوتا بلکہ خشیت و تواضع ہوتی ہے۔

علم کے حصول میں سے اہم خلوص کا پیدا کرنا ہے اور خلوص و اخلاص کے معنی یہ ہیں کہ اعمال ہر طرح کے شوائب سے پاک ہوں خواہ تھوڑے ہوں یا بہت، اس میں صرف تقرب الی اللہ کی نیت ہو، اس کے علاوہ کوئی اور مقصود نہ ہو۔

امام غزالی نے ایک جگہ تحریر فرمایا کہ کوئی شخص علم اس لئے حاصل کرتا ہے کہ اس طرح اس کا مال و متاع بھی محفوظ ہوگا یا اس لئے کہ وعظ و تدریس کی محفل سجائے کہ خاموشی سے اکتا گیا ہو، بولنے کی لذت حاصل کرنا چاہتا ہے، یا اس لئے کہ لوگ اس کے علم، تصنیف و تقریر و انتظامی امور کے داؤ پیچ میں مہارت کے حوالہ سے اس کا ذکر کریں، اس کی ہر وقت تعریف کی جائے اس کے نقائص پر انگلی نہ رکھی جائے، لوگ اس کا احترام کریں، تو اس کا یہ عمل اخلاص کی تعریف سے نکل جائے گا۔

علم کے حصول کا مقصود منصب و عہدہ، طلب معاش، عزت و شہرت، مباحثہ وغیرہ کے ذریعہ لوگوں پر غالب آنا نہ ہو، کیوں کہ اس قسم کی ارادی یا غیر ارادی نیتوں کا اثر یہ ہوگا کہ صرف چرب لسانی، زبان درازی، لفاظیت و لسانیت پر محنت ہوگی، بس اس کی کوشش ہوگی کہ تقریر کرنا اور اچھے انداز میں بولنا آجائے، دلچسپ عنوانات و بیانات میں ملکہ حاصل ہو جائے، مضمون سازی، مضمون نگاری میں مہارت پیدا ہو جائے، تنقید و تبصرہ کا طریقہ آجائے پھر ان چیزوں سے سمعہ و شہرت، فخر و مباہات خود بینی، خود ستائی، ہٹ دھرمی اور اپنی غلطی کا تسلیم نہ کرنا، دوسروں کے معائب پر نظر اور اپنی وقعت بٹھانے، عہدہ و کرسی کے حصول وغیرہ کے ذریعہ بیش از بیش فوائد حاصل کرنے کی طمع و حرص ہوگی، حصول جاہ و رضائے خلق کا قصد ہونا وغیرہ اغراض فائدہ کے سبب سے دوستی اخلاق و اعمال، تزکیہ نفس، تصفیہ قلب غرض اپنی اصل درستی جمع علم سے اصل مقصود ہے، ان سے بالکل بے توجہی اور بے التفائی ہوگی، اور اعمال و اخلاق سب فاسد ہو کر فساد عام کا باعث ہوں گے، جس پر سخت وعیدیں آئی ہیں۔

فقہ ابو اللیثؒ فرماتے ہیں کہ اہل علم کے اندر حسب ذیل صفات ہونی ضروری ہے۔ ۱۔ اخلاص، (۲) خوف خدا، (۳) نصیحت، (۴) شفقت، (۵) صبر و بردباری، (۶) تواضع، (۷) عفت، (۸) مطالعہ، (۹) افادہ، قلب حجاب (علم حاصل کرنے میں جائز نہیں)

(.....**بقیہ صفحہ نمبر ۶۴ پر**)

فکر اسلامی

(قسط-۳)

# مفکر اسلام- ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

**تاریخ نویسی پر بے لاگ تبصرہ:**

تاریخ نویسی پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا نے کاروان زندگی کی پانچویں جلد میں لکھا ''زیادہ تر تاریخ کی کتابیں ایک لگے بندھے نظام کے ماتحت واقعات نویسی پر اکتفا کرتی ہیں اور ان کو اس لحاظ سے ''عرفی'' اور ''اصطلاحی'' تاریخ کہنا زیادہ مناسب ہوگا،

کتاب کے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ:

''زیادہ تر تاریخ کی کتابیں ایک لگے بندھے نظام کے ماتحت واقعات نویسی پر اکتفا کرتی ہیں، اور ان کو اس لحاظ سے ''عرفی'' و ''اصطلاحی'' تاریخ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، ان کے مطالعہ سے اس عہد اور ماحول کے لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں، دماغوں کی خلشیں اور روحوں کے اضطراب معلوم نہیں کئے جا سکتے، ان مسائل و مصائب اور محسوس کئے جانے والے خطرات سے بھی آگاہی نہیں ہوسکتی، جنھوں نے اس عہد اور ملک کے باشعور اور صاحب ضمیر طبقہ کی نیند حرام کر رکھی تھی، اور اس کو مسلسل اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا، نہ اس کی روئیداد مل سکتی ہے کہ انھوں نے اس صورت حال کا کس طرح مقابلہ کیا، اور اس میں کیا اور کس طرح کی تبدیلی لانے کی کوشش کی یہ ''عرفی'' تاریخیں اپنی فنی اور موضوعی قدر و قیمت کے باوجود اس دور کی ذہنی و فکری، اخلاقی و نفسیاتی، اور شعوری و جذباتی عکاسی سے قاصر ہیں، نہ ان کے مصنفین نے اس کا دعویٰ کیا ہے، اور نہ اس کو اپنے فرائض میں سمجھتے تھے''۔

(کاروان زندگی ج ۵ ص ۷)

صاف طور پر ظاہر ہوا کہ مولانا اپنے عہد کی سچی تصویر پیش کرنے کے قائل تھے، واقعات کا تجزیہ، حالات کا جائزہ، لوگوں کے تأثرات اور اس پر برمحل تبصرہ کرنا مولانا کے نزدیک نہ صرف فرض تھا بلکہ وقت کا تقاضہ اور ملی فریضہ ہونے کے ساتھ تاریخی فریضہ بھی تھا، اس سلسلہ میں وہ کسی معذرت و مصلحت کے قائل نہ تھے۔

**عربوں کو دعوت اور وہاں کے حالات پر اظہار تأسف:** مولانا عربوں کی اصلاح کس حد تک چاہتے تھے اور اس کے لئے کس قدر کوشاں تھے اور ان سے کس قدر امیدیں تھیں اور وہاں کے حالات زندگی سے کس قدر نالاں تھے، اور پھر اس کے تدارک کے لئے انہوں نے کیا خدمات انجام دیں، اس کے لئے الگ سے ایک طویل مقالہ کی ضرورت ہے، مولانا کی بیشتر کتابوں و رسائل و خطبات کے مخاطب عرب ہی ہیں، لیکن یہاں مولانا کی اس تڑپ و امید کا اندازہ اس اقتباس سے کیجئے جو مولانا کے ایک خط کا ہے جو انہوں نے اپنے دوست مولانا مسعود عالم ندویؒ کو ان کے قیام حجاز کے دوران لکھا تھا، یہ اقتباس جذبات کا عکاس اور ان کے فکر و اضطراب کی جھلکیاں بڑی خوبصورت اور جامع انداز میں پیش کر رہا ہے:

''دین کی تخم ریزی کے لئے اس کشت ویراں میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھئے، حجت تمام کر دیجئے دن رات ایک کر دیجئے، دل کو جلایئے اور بدن کو گھلایئے، خون دیدہ اور خون جگر بہایئے اور اس طرح بہایئے کہ دجلہ و فرات اپنی تنگ ظرفی اور کم مائیگی پر ماتم کریں، ایک

ایک کا گریباں تھام کر کہیئے کہ اے صحرائے عرب کے بھٹکے ہوئے آہو، اے عالم کی آبرو، اے ابراہیمؑ ومحمدﷺ کی آرزو تو کہاں گم ہے؟ کیا سیدنا عمرؓ کی دعائے نیم شبی اور آہ سحر گاہی، مثنی بن حارثہؓ کا خون شہادت، ابوعبیدہ الثقفیؓ کی پامالی اور استخوان شکنی، سعد بن ابی وقاصؓ کی علم برداری، علی بن ابی طالبؓ کی جگر سوزی، اشک ریزی اور خطابت وتاثیر کی طوفان خیزی، آبروئے شہیداں، جگر گوشۂ رسولؐ کی تشنگی اور خاندانِ رسالت کے خون کی ارزانی، ابوحنیفہؒ کی دماغ سوزی، احمد بن حنبلؒ کی تعزیر جرمِ عشق، ابن جوزیؒ کی حمایت سنت، عبدالقادر جیلانیؒ کی دردمندی کا حاصل صرف یہ ہے کہ تو ائمہ ضلالت کا ادنیٰ غاشیہ بردار اور اس کی راہ کا غبار ہے، عراق کے اس مقبرے میں صور پھونک دیجئے اور شورِ قیامت برپا کیجئے کہ ''گرفتہ چینیاں احرام ومکی خفتہ دربطحا'' (کاروان زندگی ج۱ص ۳۵۱-۳۵۲)

مغرب نے حجاز پر اس وقت ہی کس قدر کنٹرول حاصل کرلیا تھا اور حجاز کے حالات کس تیزی کے ساتھ تبدیل ہورہے تھے اور مولانا کو اس کی کیسی فکر تھی اس کا اندازہ مولانا کے اس خط کے ایک اقتباس سے کیجئے جو انہوں نے اپنے برادر معظم کو ۱۹۵۰ء کے سفر میں حجاز سے لکھا ہے، جبکہ پہلے سفر کا اور وہاں کے حالات پر تبصرے کا ذکر " بین الجبایة والهدایة " کے ضمن میں آچکا ،۱۹۵۰ء میں مولانا کے قلم سے نکلا ہوا یہ جملہ آج کے لحاظ سے کتنا معنی خیز اور اس وقت کے لحاظ سے کتنی دور اندیشی اور حقیقت شناسی وحق ترجمانی پر مبنی تھا ''عالم اسلام کا قبلہ مکہ معظمہ اور بیت اللہ ہے اور مرکزِ اسلام کا قبلہ سرِ دست امریکہ ہے:

''۴۷ء میں ہم پہلی بار یہاں آئے تھے، اب ۵۰ء میں آئے ہیں، تین برسوں میں کھلا ہوا تغیر محسوس ہوتا ہے، بازار سے لے کر لوگوں کے دماغوں تک، مغربی تمدن، تجارت، معاشیات اور افکار و خیالات کے پنجے اور زیادہ گڑ چکے ہیں، جدہ اترتے ہی اس کا احساس ہوتا ہے اور جس قدر حالات سے واقفیت ہوتی ہے اتنا ہی اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، کوئی نہیں جانتا، خوب صورت عربی لباس میں کتنے دل و دماغ خالص مغربی بن چکے ہیں اور قرآنی زبان کتنے مغربی خیالات اور خالص مادی تخیلات کا ذریعۂ اظہار بنتی ہے، معاش کا انہماک، دولت آفرینی کی عادت بحرانی حد تک پہنچ چکی ہے، زندگی کا تصور اس کے بغیر ان کے نزدیک ممکن نہیں کہ اس کے سایہ میں پناہ لی جائے اور ترقی کی جائے، عالم اسلام کا قبلہ مکہ معظمہ اور بیت اللہ ہے اور مرکزِ اسلام کا قبلہ سرِ دست امریکہ ہے، وبائے عام کی طرح اس کا اثر فضا اور ہوا میں ہے، اس کے مقابلہ میں ہماری حقیر کوشش چند کتابیں، چند ملاقاتیں، جماعتوں کے گشت اور نقل و حرکت بالکل وہ حیثیت رکھتی ہے جو کسی سمندر میں ٹھیکریاں پھینکنے سے ہلکے تموج کی حیثیت ہوتی ہے، ادھر ملاقاتوں اجتماعات اور چند شخصیتوں کے اتفاق واستحسان سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، حقیقت میں ان کی حیثیت تلاش و جستجو سے زیادہ نہیں'' (کاروان زندگی ج۱ص ۳۵۹)

## فلسطین کا سودا شاہانِ عرب نے کیا:

موجودہ ایام میں اگر یہ بات کہی جاتی ہے کہ فلسطین کا المیہ محض ایک ڈرامہ ہے اور اس کے کردار عرب حکام وشاہان ہیں تو کچھ لوگ بہت چیں بہ جبیں ہوتے ہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ عرب حکمرانوں نے اس گھناؤنے ڈرامے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے یا یوں کہیے کہ کٹ پتلی بن کر ناچے ہیں اور فلسطینی قوم کے ساتھ قبلہ اولیٰ اور حرم ثالث کا سودا کیا ہے، اپنے ۱۹۵۱ کے مشرق وسطی کے دورے کے بعد مولانا نے جو تأثرات لکھے ان سے یہی حقیقت مزید واشگاف ہوتی ہے:

''عمان و بیت المقدس کے سفر میں فلسطین کے بارے میں معتبر و ذمہ دار اشخاص کے ذریعہ وہ افسوسناک حقائق معلوم ہوئے جن کا علم کسی کتاب کے مطالعہ سے نہیں ہوسکتا تھا، اس کا لبّ لباب یہ ہے کہ مسئلہ فلسطین ایک ڈرامہ تھا جس کو انگریزوں اور ان

کے پٹھوؤں نے پہلے سے تیار کر رکھا تھا، اس کے کردار عرب، عرب بادشاہ اور حکومتیں تھیں، یہ ڈرامہ فلسطین کے اسٹیج پر کھیلا گیا اور عالم عربی اور عالم اسلام کی آنکھوں میں دھول ڈال کر برطانیہ اور صہیونی یہودیوں کے منصوبے کو پورا کیا گیا، یہ ایک سوچی سمجھی شاطرانہ اسکیم تھی، مسلمانوں کی اس ذلت ورسوائی کے معاملہ میں آزاد فلسطینی قوم سب سے زیادہ بے قصور ہے، اصلاً فلسطین کا خون عرب حکومتوں اور ان کے قائدین اور عرب لیگ کی گردن پر ہے، بعض لوگوں نے رو رو کر یہ داستانِ رسوائی سنائی، ان میں مسجدِ اقصیٰ کے امام اور وہاں کے مقیم، معمر شیوخ اور اہل حمیت عرب تھے، میں نے خود بھی مسجد اقصیٰ کے چند روزہ قیام میں فلسطینیوں کو پردیسیوں، یتیموں کے حال میں دیکھا، ان کے دل ٹوٹے ہوئے اور سر جھکے ہوئے تھے، میں نے ان کو شکستہ خاطر اور زخم خوردہ پایا، وہ ایسے واقعات بیان کرتے جو آنکھوں کو اشکبار اور دل کو غمزدہ بنا دیتے، عرب زعماء ارملک کے قائدین پر سے ان کا بھروسہ اٹھ چکا تھا۔" (کاروان زندگی ج ا ص ۳۸۷)

اپنے مشہور مقالہ العوامل الأساسية فی کارثة فلسطین میں جو اسی سفر میں دمشق یونیورسٹی کے ہال میں عیسائی وائس چانسلر کی صدارت میں پڑھا ان حقائق کا اظہار کیا اور اس سلسلہ میں مولانا آخر تک اسی نظریہ پر قائم رہے بلکہ بارہا اسی کو دہرایا:

"مقالہ میں ان اہم اسباب سے بحث کی گئی، جو المیۂ فلسطین کے ذمہ دار ہیں، ان میں پہلا سبب اپنے اصول وعقیدہ پر مر مٹنے اور جان کی بازی لگا دینے والے جذبہ کا فقدان تھا، دوسرے اس ذہنی ونفسیاتی کیفیت کا فقدان جس کو اقبال نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

تیسرا سبب یہ ہے کہ عرب حکومتوں اور قوموں میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جس کے دل ودماغ پر فلسطین کا مسئلہ چھا جائے اور اس کی صلاح الدین ایوبیؒ کی طرح وہ کیفیت ہو جائے جس کو ان کے سکریٹری ابن شداد نے اس طرح بیان کیا ہے۔ "معلوم ہوتا تھا کہ ماں کی گود میں اس کے اکلوتہ بچہ کو کسی نے حلال کر کے ڈال دیا ہے،" فلسطین کا مسئلہ جب کبھی حل ہوگا، اسی طرح حل ہوگا، کانفرنسوں، ریزولیشنوں اور خوشامدوں سے حل نہیں ہوگا"۔ (کاروان زندگی ج ا ص ۳۸۸-۳۸۹)

## قضیۂ فلسطین کا حل:

نہ جانے اس قضیہ کو حل کرنے کے لئے کتنی اور کیسی کیسی کوششیں ہوتی رہتی ہیں، لیکن مرض دوا دینے کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے، مولانا نے رابطۂ عالم اسلامی میں یاسر عرفات کی موجودگی میں ایک تقریر کی تھی جسمیں مثبت انداز میں اصل بات کو پوری صفائی کے ساتھ پیش کیا، اس تقریر کی رکارڈنگ ندوۃ العلماء میں مسجد اقصیٰ کے امام کی آمد پر استقبالیہ تقریر میں سنائی گئی:

".....اس موقع پر راقم کی اس تاریخی تقریر کا جو اس نے رابطۂ عالم اسلامی (مکہ معظمہ) کے ہال میں یاسر عرفات کی موجودگی میں کی تھی، ٹیپ سنایا گیا، جس میں ان کو صلاح الدین ایوبی کی طرح خالص مسلمانوں پر اعتماد کرنے، ایمانی جذبہ، شوق شہادت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے مقصد سے کام لینے کی تلقین کی گئی تھی، اور کہا گیا تھا کہ صرف اسی کے ذریعہ فلسطین کا مسئلہ حل اور مسجد اقصیٰ کی بازیابی ہو سکتی ہے، اور یہی مسلمانوں کی سب سے بڑی طاقت ہے "ان تکونوا تالمون فانهم يالمون كما تالمون وترجون من الله مالايرجون، وكان الله عليما حكيما (النساء:۱۰۴) (اگر تم کو دکھ پہونچا تو وہ بھی تو دکھ اٹھائے ہوئے ہیں جیسے تم دکھ اٹھائے ہوئے ہو، اور تم اللہ سے وہ امید لگائے ہوئے ہو جو وہ نہیں رکھتے، اور اللہ تو ہے ہی بڑا علم والا بڑی حکمت والا) (کاروان زندگی ج ۵ ص ۶۰-۶۱)

☆☆☆

نقطۂ نظر

# امریکا کا سامراجی کردار اور امت مسلمہ

عبدالرشید صدیقی

بلاشبہہ یہ ایک حقیقت ہے کہ متحدہ ریاست ہائے امریکا ایک سامراجی مملکت ہے۔ سوویت یونین کے سقوط کے بعد جب کمیونسٹ بلاک منتشر ہوگیا تو پھر امریکا تاریخ کا سب سے زیادہ بااثر ملک بن گیا جس کا دبدبہ تمام عالم پر چھا گیا۔ اس کے فوجی اڈے دُنیا کے ۱۴۰ ممالک پر محیط ہیں۔ ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء (نائن الیون) کے حادثے سے پہلے بھی امریکی فوج ۷۰ ممالک میں مستقلاً اپنے اڈے قائم کیے ہوئے تھی۔ نائن الیون کے حالات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اور اپنے مفروضہ خدشات کی بنا پر اس نے اپنی فوجی قوت کو دگنا کر دیا۔ اس کی عسکری طاقت کا اندازہ صرف اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اس کی افواج اور ملٹری اخراجات کا بجٹ دیگر بڑی بڑی طاقتوں کے مقابلے میں پانچ گنا زیادہ ہے۔ ظاہر ہے یہ اس کے دفاع اور ملک کی حفاظت سے کہیں زیادہ ہے۔

امریکا نے اس بہانے، کہ وہ دنیا میں امن اور جمہوریت کو فروغ دینا چاہتا ہے، ان وسائل کے حصول کو سندِ جواز بخشی ہے اور اس زبردست قوت کو مجتمع کیا ہے۔ حالانکہ اگر حقائق پر نظر رکھی جائے تو پچھلے ۵۰ برسوں میں امریکا کئی وسیع پیمانے پر ہونے والی جنگوں میں ملوث رہا ہے۔ یہ جنگیں کوریا، ویت نام، کمبوڈیا، لاؤس، صومالیہ، عراق (دومرتبہ) اور افغانستان میں ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت ساری مختصر فوجی کارروائیاں کیوبا، پاناما اور سربیا میں بھی کی گئی ہیں۔ مزید فوجی انقلاب (coup) جو ایران، گوئٹے مالا، برازیل، انڈونیشیا، نکاراگوا اور چلّی میں برپا ہوئے ان میں امریکا کی پشت پناہی شامل رہی۔ اس پر مستزاد یہ کہ جو عوامی تحریکات یونان، فلپائن اور دیگر جنوبی امریکا کے متعدد ممالک میں ہوئیں ان کو ناکام بنانے اور دبانے میں امریکا کا ہاتھ رہا ہے۔ فرڈینڈ ماؤنٹ ایک برطانوی مبصر کا تجزیہ ہے کہ ۱۶۸ مختلف فوجی اقدامات میں امریکی افواج کا دخل رہا ہے۔ ان جنگوں میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد کئی ملین کے قریب ہے۔ اس طرح یہ سامراجی قوت نہایت سفّاک اور بدطینت ہے، بمقابلہ ان قوتوں کے جو پہلے گزر چکی ہیں۔ اس بات کی تائید رچرڈ فالک (Richard Falk) نے اپنی کتاب Choose and Counter After the Arab: Revolution Spring (انقلاب کا انتخاب اور

مقابلہ کیجیے، عرب بہار کے بعد) جو اس سال شائع ہوئی، میں کی ہے۔ انھوں نے 'بہارِ عرب' کے حوالے سے جو تجزیہ پیش کیا ہے اس میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے:

امریکا کی نہایت اہم حکمت عملی اس خطے کے لیے عام طور پر یہی رہی ہے کہ وہ ظالمانہ اور آمرانہ حکومتوں کی پشت پناہی کرے تاوقتیکہ وہاں کی قیادت مغرب کے ساتھ دوستانہ رہے۔ اگر حکومت کے بارے میں یہ تاثر ہو کہ وہ مخالفانہ رویہ رکھتی ہے یا اپنی مملکت کو قابو میں نہیں رکھ سکتی تو اس صورتِ حال میں وہ امریکی فوجی مداخلت کا نشانہ بن جاتی ہے، تاکہ اس کے بجائے کوئی اور دوستانہ، فرماں بردار اور بااثر قیادت کو اقتدار حاصل ہو جائے۔ (ص ۱۴)

فوجی کارروائیوں کے علاوہ بھی امریکی استعماری قوت کا مظاہرہ اس کی عالمی، تجارتی اور مالیاتی سرگرمیوں سے ہوتا ہے، جسے coca-colonization کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ امریکی تجارتی ادارے اپنے مشروبات اور مصنوعات دنیا بھر میں رائج کر کے اپنے کلچر اور ثقافت کو خوب فروغ دے رہے ہیں۔ ہندستانی نژاد راہول مہاجن اپنی کتاب The New Crusede American War on Terrorism (نئی صلیبی جنگ: امریکا کی دہشت گردی کے خلاف جنگ) میں لکھتے ہیں:

ترقی یافتہ ممالک کے تجارتی اداروں کو پس ماندہ ممالک کے تجارتی اداروں کے مقابلے میں بہت زیادہ فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ یا تو وہ ان کو ضم کر لیتے ہیں یا بالکل تباہ کر دیتے ہیں۔ اس وجہ سے امریکا کے آزادانہ تجارتی معاہدات اصلاً پس ماندہ ممالک کی آزادانہ پالیسی کے لیے پیغامِ موت ہے۔ نئے عالمی نظم (New World Order) کو بروے کار لانے اور ان ممالک میں اپنا کنٹرول قائم کرنے کے لیے آئی ایم ایف (عالمی مالیاتی فنڈ)، عالمی بنک، عالمی تجارتی ادارہ جو بظاہر بین الاقوامی ادارے ہیں لیکن حقیقتاً یہ سب امریکا کے کنٹرول میں ہیں، اس کے آلۂ کار ہیں۔ (ص ۱۰۲-۱۰۳)

متحدہ ریاست ہاے امریکا اب ایک نئی سامراجی قوت ہے اور اس کی فوجی قوت کے علاوہ چونکہ آئی ایم ایف اور عالمی بنک بھی اس کے دائرۂ اقتدار میں ہیں، اس لیے اس نے ترقی پذیر ممالک کو قرض کے پھندوں میں جکڑ رکھا ہے۔ ان ممالک کو ان بین الاقوامی اداروں کی عائد کردہ پابندیوں کو مجبوراً قبول کرنا ہوتا ہے تاکہ ان کو قرض مل سکے۔ انھیں اپنی برآمدات کو بڑھانے کی خاطر اپنے مزدوروں کی تنخواہوں کو کم کرنا پڑتا ہے۔ وہ بین الاقوامی کمپنیوں کو اپنے ملکوں میں تجارت کرنے کی سہولتیں دینے پر مجبور ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مقامی کمپنیاں ان سے مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اس طرح آزادیِ تجارت کے بہانے امریکا اور اس کے تجارتی ادارے بین الاقوامی تجارت پر پوری طرح حاوی ہیں۔ آئی ایم ایف، عالمی بنک اور WTO کی بدولت امریکا کا تسلط ترقی پذیر ممالک پر قائم ہے۔ بظاہر یہ ممالک آزاد اور خودمختار ہیں لیکن حقیقتاً سب امریکا کی غلامی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ امریکی قوت اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ ان ممالک میں آمرانہ اور کٹھ پتلی حکمران برسرِ اقتدار رہیں تاکہ وہ اپنے آقا کے احکامات کو نافذ کر سکیں۔ انھیں حقوقِ انسانی اور معاشرے کی فلاح و بہبود کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں ہوتی اور وہ لوگ جو امریکا کی پالیسیوں سے انحراف کا

راستہ اختیار کرنے کی جرأت کرتے ہیں ان کو دست بردار کر دیا جاتا ہے اور ان کے بجائے اپنے فرماں بردار لوگوں کو مسلط کر دیا جاتا ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ یہ سب ڈراما حقوقِ انسانی اور جمہوریت کے نام پر رچایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس صورتِ حال کو حقوقِ انسانی کا امپریلزم کہتے ہیں، جو حقوقِ انسانی کی اصطلاح کی توہین ہے اور ناقابلِ قبول تصور ہے۔

عسکری، سیاسی، تجارتی اور مالیاتی ہتھکنڈوں کے ساتھ میڈیا کی قوت ہے جسے سامراجی مقاصد کے لیے بے دریغ استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اب اس نئی سامراجیت کا اصل ہدف اُمت مسلمہ ہے اور خاص طور پر اسلامی تحریکات جو امریکا کے عالمی تسلط کے منصوبے میں مزاحم سمجھی جاتی ہیں۔ مغربی مفکرین برملا یہ کہہ رہے ہیں کہ احیاے اسلام کے لیے کوشاں جماعتیں ان کے لیے خطرے کا باعث ہیں۔ فرانسس فوکویاما جو مشہور امریکی دانش ور ہے، اپنے ایک مضمون 'اصلی دشمن' (The Real Enemy) میں، جو نیوز ویک کے دسمبر ۲۰۰۱ء کی خاص اشاعت میں شائع ہوا تھا، ۲۰۰۲ء کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اسلامی انقلاب پسند کسی طرح بھی اختلافات کو برداشت نہیں کریں گے۔ یہ لوگ ہمارے دور کے فاشسٹ ہیں اور ہمیں ان کے خلاف جنگ کرنا ہوگی۔ اس کا پیغام بالکل واضح ہے۔ اگر مسلمان مغرب کے ساتھ اپنے تعلقات برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو وہ اسلامی آئیڈیالوجی ترک کر دیں کیونکہ یہ نہ صرف مذہبی رسومات تک محدود ہے بلکہ زندگی کے تمام شعبوں پر، چاہے وہ سماجی ہوں، سیاسی ہوں یا ثقافتی، حاوی ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ جنگ جو ہمارے ایمان اور طرزِ حیات پر مسلط کی جا رہی ہے اس کے مقابلے کے لیے حکمت عملی کیا ہے؟ ایک نہایت آسان سا راستہ تو یہی ہے کہ ہم یہ سب من وعن قبول کر لیں جو ہم پر تھوپا جا رہا ہے۔ یہ رویہ تو ہمارے بہت سے لیڈر جو مغرب کی طاقت سے بے حد مرعوب ہیں، قبول کرنا چاہتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان میں اتنی حکمت نہیں ہے کہ وہ یہ چیلنج قبول کریں لیکن ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ سچائی کی راہ پر چلنا کبھی بھی آسان نہیں ہوتا۔ یہ راہ مشکلات سے گھری ہوئی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ نیکی کی راہ تنگ ہے اور اس پر چلنے والے کم ہی ہوتے ہیں، لیکن بدی کا راستہ کشادہ اور آسان ہوتا ہے اور اس پر چلنے والوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ نشیب کی طرف پھسلنا آسان ہوتا ہے لیکن اُونچائی پر چڑھنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عقبہ (دشوار گزار گھاٹی) سے سورۃ البلد میں موسوم کیا ہے اور فرمایا: ''ہم نے دونوں نمایاں راستے دکھا دیے ہیں مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہ کی''۔

قرآن میں انبیا علیہم السلام کے متعدد واقعات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت کم لوگوں نے ان کی دعوت کو قبول کیا لیکن وہ بددل نہیں ہوئے بلکہ اپنے مشن پر مسلسل گام زن رہے۔ انھوں نے مصالحت کی آسان راہ نہیں اختیار کی۔ یہی وہ راہ ہے جو ہمیں اختیار کرنی ہے۔ ایک مرتبہ پُریقین ہو کر اگر ہم نے اپنے آپ کو اس کام پر لگا دیا ہے تو پھر کوئی پس و پیش کا سوال ہی نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں مستقل مزاجی سے تمام مشکلات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

## درپیش چیلنج اور حکمت عملی:

اس صورتِ حال میں مسلمان حکومتوں کی کیا ذمہ داریاں

ہیں؟ ایک اہم موضوع ہے جس پر مفصل گفتگو کی ضرورت ہے۔ فی الوقت صرف اُمت مسلمہ کی اور بالخصوص وہ مسلمان جو مغرب میں آباد ہیں ان کی ذمہ داریوں کی نشان دہی مقصود ہے۔ کیوں کہ ان کا سابقہ وہاں کی مقامی آبادی سے رہتا ہے اور ان کی اہم ذمہ داری یہ ہے کہ اسلام کی دعوت کو وہاں عوام تک اس طرح پہنچائیں کہ وہ اسلام کے بارے میں ان بدگمانیوں کو دور کرسکیں تاکہ خوف کی فضا (Islamphobia)، جو بنائی جارہی ہے، وہ دور ہوسکے۔ خاص طور سے ان حالات میں` جب کہ ہم میں سے کچھ عاقبت نااندیش افراد اور جماعتوں نے جہاد کے نام پر جارحیت اور دہشت گردی کی راہ اختیار کرکے اسلام کو بدنام کیا ہے، اور دعوتِ اسلامی کی کوششوں کو اور مشکل بنادیا ہے اور اس کی راہ مسدود کی ہے۔ تاہم ان تمام مسائل اور مشکلات کے علی الرغم ہمیں ایک منضبط راہِ عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں پوری اُمت مسلمہ اور خصوصیت سے مغربی ممالک کے مسلمانوں کی خدمت میں کچھ گزارشات غور کرنے کے لیے پیش کی جارہی ہیں۔

۱۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ ہمارا اللہ تعالیٰ پر پختہ ایمان ہو اور ہم مسلسل اس کی مدد طلب کرتے رہیں۔ اللہ سے اپنے تعلق کو استوار رکھیں۔ وہ نہایت رحیم و شفیق ہے اور اس کا یہ وعدہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو تمام مشکلات سے نجات دے گا جو اس پر ایمان رکھتے ہیں: تب ہم نے اس کی (حضرت یونسؑ) کی دعا قبول کی اور غم سے اس کو نجات بخشی اور اس طرح ہم مومنوں کو بچالیا کرتے ہیں۔ (انبیاء۔۲۱:۸۸)

ہمیں اپنے مقصد کا پورا شعور ہو کہ ہمیں اللہ کی بات اس کے بندوں تک پہنچانی ہے اور اس کے لیے ہر ممکنہ جدوجہد کریں تو ضرور اللہ کی مدد ہمارے شاملِ حال ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ بھی فرمایا ہے:

اور جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے اور ہو وہ مومن تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی۔ (بنی اسرائیل ۱۷:۱۹)

۲۔ ہر انسان کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے خود ہی کی ہے جیسا کہ فرمایا: ''جب تمھارے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں ایک بشر پیدا کررہا ہوں، جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا'' (الحجر ۱۵۔۲۸۔۲۹)، تو پھر ہم کیوں کسی شخص کو اسلام کی نعمت سے محروم رکھیں۔ یہ اُمت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام انسانوں تک جہاں کہیں بھی ہوں اسلام کی دعوت پہنچائے۔ جو بھی ذرائع ہمیں میسر ہیں ہم اپنے دوستوں، رشتہ داروں، ہمسائیوں کو چاہے قریب ہوں یا دور، اللہ تعالیٰ کے پیغامِ رحمت و فضل سے محروم نہ رکھیں۔

۳۔ ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ ہر انسان بدل سکتا ہے۔ برائی کو اچھائی سے بدلا جاسکتا ہے جیسا کہ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور اے نبی ﷺ نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ (حم السجدہ ۴۱:۳۴)

ہمیں اپنی تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ کس طرح دشمن، جانثار دوست بن گئے۔ تاتاریوں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور خلافتِ عباسیہ کا قلع قمع کردیا تھا لیکن

پھر یہی تاتاری ایمان لاکر اسلام کے داعی بن گئے۔ اقبال نے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے:

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

۴۔ انسان کو متاثر کرنے کی کنجی اس کے دل میں ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بڑی حکمت کی بات فرمائی ہے:

دلوں کی کچھ خواہشیں اور میلانات ہوتے ہیں اور کبھی کسی وقت وہ بات سننے کے لیے تیار رہتے ہیں اور کسی وقت تیار نہیں رہتے۔ تو لوگوں کے دلوں میں ان میلانات کے اندر سے داخل ہو اور اس وقت اپنی بات کہو جب وہ سننے کے لیے تیار ہوں، اس لیے کہ دل کا حال یہ ہے کہ جب اس کو کسی بات پر مجبور کیا جاتا ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ (کتاب الخراج، ابو یوسف بحوالہ راہِ عمل، جلیل احسن ندوی، ص ۳۳۲)

یہ اس بات کی تلقین ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی: اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔ (النحل ۱۶:۱۲۵)

۵۔ بہت کم لوگ کتابیں پڑھ کر اور تقریریں سن کر متاثر ہوتے ہیں۔ عمل اور پاکیزہ اعلیٰ اخلاق کے مظاہر الفاظ سے زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نرم مزاجی اور اعلیٰ اخلاق اور ساتھ ہی طبیعت کی گرم جوشی اور رحم دلانہ برتاؤ تھا جس نے لوگوں کے دل جیت لیے تھے۔ اس بات کی تصدیق خود قرآن نے کی ہے: یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تُند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ (اٰلِ عمرٰن ۳:۱۵۹)

یہ ہمارے آبا و اجداد ہی کے اخلاق تھے جن سے ساحل مالابار (جنوب مغربی ہندستان)، ملایشیا اور انڈونیشیا میں لوگ مسلمان ہوئے۔ وہاں یہ لوگ بطور تاجر گئے تھے اور وہاں جا کر انھوں نے اسلامی تعلیمات کو پھیلا دیا اور ملک کے ملک مسلمان ہو گئے۔ ان ممالک میں مسلمانوں نے کوئی فوج کشی نہیں کی۔ ہمیں غیر مسلموں کے دل جیتنے ہیں۔ انھیں اسلام کی طرف راغب کرنا ہے، اس لیے بین المذاہب مکالمات اور آپس کے تعلقات کو بحال کرنا ہوگا۔ ممکن ہے کہ ہماری کوشش کے باوجود ہم بہت سارے لوگوں کو اسلام کے دامن میں نہ لا سکیں۔ تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ ہم بہت سے لوگوں کے دلوں میں اسلام کے لیے نرم گوشہ پیدا کر سکیں۔ اس طرح اگر ہم اپنی دعوت کو عام کرنے کی کوشش کریں تو اللہ سے اُمید ہے کہ یہ نفرت کی فضا جو اسلام کے خلاف پھیلی ہوئی ہے بدل جائے اور اسلام کی صحیح تعلیمات عوام تک پہنچ جائیں اور ہم ان کے دل جیت سکیں۔

۶۔ تشدد اور جذباتیت کے بجاے اگر ہم حکیمانہ طور سے لوگوں کے دل جیتنے کی کوشش کریں تو اس میں کامیابی ہو سکتی ہے۔ اگر اس طرح کی نعرے بازی کی جائے جو لوگوں کو خوف زدہ کرے تو وہ کیوں ہماری بات سنیں گے۔ لہٰذا بجاے جارحانہ رویے کے اگر ہم حکمت اور دانائی سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں تو کامیابی ہو سکتی ہے۔ اگر ہم لوگوں کی بھلائی اور ان کے مفاد کے لیے کام کریں تو وہ یقیناً اس کو سراہیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ جس طرح مغرب کے لوگوں کا اسلام اور مسلمانوں کا کلچر سمجھنا ضروری

ہے، اسی طرح ہمیں بھی مغرب کی ان اقدار جیسا کہ منصفانہ رویہ، خیر خواہی کا جذبہ، جمہوری طریقۂ کار اور وقت کی پابندی کی قدر کرنی چاہیے۔

۷۔ مغربی ممالک میں جمہوری طریقۂ کار رائج ہے۔ اقتدار محض مرکزی حکومت کے پاس نہیں ہوتا۔ اپوزیشن پارٹی کے منتخب نمایندے، لوکل کونسلر، میڈیا کے نمایندے، پریشر گروپ اور خود مرکزی اور لوکل گورنمنٹ کی مشینری، ان سب کا اثر حکومت کی پالیسی بنانے میں شامل ہوتا ہے۔ اگر ان اداروں میں بھی ہماری موجودگی ہو یا ان تک ہماری رسائی ہو تو ہم بھی بااثر ہو سکتے ہیں۔

۸۔ مسلمان بحیثیت مجموعی علم کے میدان میں بہت پیچھے ہیں۔ علم کے تمام شعبوں میں خاص طور سے سائنس اور ٹکنالوجی میں ہمیں کافی پیش رفت کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک ہم ان علوم میں فوقیت حاصل نہیں کرتے ہم مغرب میں وہ مقام نہیں حاصل کر سکتے کہ دنیا کو درپیش مسائل کا کوئی حل پیش کر سکیں اور اس طرح دنیا کی قیادت کا مقام حاصل کر سکیں۔

مغرب میں اب مسلمان غیر مسلموں کے ہمسایے ہیں۔ وہ یورپ اور امریکا کے کارخانوں، فیکٹریوں، دفتروں، اسکولوں اور کالجوں میں غیر مسلموں کے ساتھ شریک ہیں۔ اس لیے یہ لازمی ہے کہ ان میں باہم اعتماد اور حمیت کی فضا ہو، نہ کہ شک و شبہے کی۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کو اسلام کی دعوت غیر مسلموں تک پہنچانے کے بہترین مواقع حاصل ہیں۔ وہ اپنے کردار اور اخلاق کے ذریعے لوگوں کو متاثر کر سکتے ہیں۔

ہمیں سوپر پاور سے خوف زدہ اور مرعوب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بقول پروفیسر خورشید احمد: ''تاریخ ایک دو نہیں بلکہ درجنوں سوپر پاور کا قبرستان ہے''۔ ہم نے اپنی زندگی میں دیکھ لیا کہ وہ برطانیہ جس کی سلطنت پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا، اس کی یہ شہنشاہیت ختم ہوگئی۔ اسی طرح سوویت یونین جس کا بڑا دبدبہ تھا، شکست و ریخت کا شکار ہوگیا۔ فوکویاما جو The End of History and The Last Man (تاریخ کا اختتام اور آخری انسان) کا مصنف ہے اور اس طرح کے اور لوگ جو سمجھتے ہیں کہ امریکا ہمیشہ کے لیے سوپر پاور رہے گا، انھوں نے تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ اس کے برعکس نیل فرگوسن جو اگرچہ امپریلزم کا زبردست حامی ہے اور عراق میں جنگ کے حق میں تھا، اس نے اپنی کتاب The Rise and Fall of: Colossus American Empire (عظیم الجثہ: امریکی ریاست کا عروج و زوال) میں پیش گوئی کی ہے کہ امریکا اپنی سامراجی قوت کو قائم نہیں رکھ سکے گا اور اس کا خاتمہ اور تباہی کا سبب اس کی داخلی قوتیں ہی ہوں گی۔

اگرچہ موجودہ صورت حال میں ہمارا کام مشکل ہے، لیکن اس میں ہمارے لیے بڑا اجر بھی ہے۔ ہمیں صبر و ثبات اور حکمت و دانش مندی سے تمام علوم اور ہنر حاصل کرتے ہوئے اللہ کے دین کی دعوت اوروں تک پہنچانا ہے۔ بلاشبہہ اُمت مسلمہ اس وقت نہایت نازک دور اور کڑی آزمایش سے گزر رہی ہے لیکن ہمیں پُرامید رہنا چاہیے۔ اگر ہم اپنے ایمان اور دلی وابستگی کے ساتھ اس راہ پر پوری طرح گامزن رہیں تو ان شاء اللہ اس کی مدد ضرور شاملِ حال ہوگی۔

☆☆☆

نقطۂ نظر

# ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

عطاء الحق قاسمی

ہمارے ذہنوں میں مولوی کا تصور وہی ہے جو آدھی رات کو مسجد کے چیختے چنگھاڑتے لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے یا سیاسی مولویوں کی دوعملی ہمارے ذہنوں میں مولوی کا امیج مسخ کرنے کا باعث بنی ہے لیکن میں ''مولویوں'' میں اٹھتا بیٹھتا ہوں۔ ان کے مثبت اور منفی پہلو دونوں میرے ذہن میں ہیں۔ وہ جو صحیح معنوں میں مولوی ہیں، ان کا وژن بہت وسیع ہے۔ مسٹر حضرات ان کی جہتوں سے واقف ہی نہیں ہیں۔ ان کا طرز استدلال بڑے بڑے بزرجمہروں کا منہ بند کرنے والا ہوتا ہے۔ ہمارے مسٹر حضرات مولوی پر جہاں اور بہت سے اعتراضات کرتے ہیں، وہاں وہ بہت عرصے سے مولوی کو مسلم امہ کے ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانے کا ذمہ دار بھی ٹھہراتے ہیں اور ہم لوگ ان کی بات پر یقین کرتے چلے جاتے ہیں۔

مجھے گزشتہ روز ڈاک میں مولانا زاہد الراشدی کی شائع شدہ ایک تحریر ملی جو انہوں نے مدرسہ اسلامیہ محمودیہ سرگودھا کے سالانہ اجتماع کے موقع پر کی تھی۔ اس میں مولانا نے دیگر الزامات کے علاوہ اس الزام کا جواب بھی دیا ہے جو مولوی حضرات پر مسلمانوں کے ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانے کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ مجھے مولانا کی بات میں وزن محسوس ہوا ہے اور یوں صورت حال 'ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا' والی لگتی ہے۔ مولانا کی تقریر سے ایک طویل اقتباس درج ذیل ہے:

''سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے آج ہم دنیا میں اپنے جائز مقام سے محروم ہیں اور ہمارے مصائب وآلام کی ایک بڑی وجہ یہ ہے۔ صرف ایک مثال سے بات سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ نے آج سے پون صدی یا ایک صدی قبل ہم مسلمانوں کو بہت بڑی دولت سے نوازا۔ خلیج میں تیل کی دولت دی۔ یہ ہمارا ادبار کا دور تھا، زوال کا دور تھا مگر اس دور میں بھی اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے وقت کی سب سے بڑی دولت عطا فرمائی لیکن ہماری حالت یہ تھی کہ ہم تیل زمین سے نکالنے کی صلاحیت سے محروم تھے، چشمے کھودنے کی تکنیک سے بے بہرہ تھے، تیل نکال کر اسے ریفائن کرنے کی صلاحیت سے ہم کورے تھے اور تیل کو ریفائن کرنے کے بعد دنیا کی مارکیٹ میں بیچنے کے لیے مارکیٹنگ کی صلاحیت بھی ہم میں موجود نہیں تھی جس کی وجہ سے ہم مغربی ماہرین کو بلانے پر مجبور ہوئے۔ مغربی ماہرین آئے، پھر مغربی کمپنیاں آئیں، ان کے بعد بینک آئے، پھر سیاست کار آئے اور ان کے ساتھ مغرب کی فوجیں بھی آ گئیں جو آج تیل کے چشموں کا گھیرا ڈالے بیٹھی ہیں۔

ذرا خیال کیجیے کہ تیل ہمارا، چشمے ہمارے، کنویں ہمارے، زمین ہماری لیکن ان پر قبضہ کس کا ہے؟ اور کس وجہ سے ہے؟ یہ ہماری نااہلی تھی کہ ہم تیل نکالنے، صاف کرنے اور عالمی مارکیٹ میں اسے بیچنے کی صلاحیت سے محروم تھے جس کی وجہ سے مغرب سے ماہرین آئے اور آج ماہرین، کمپنیاں، بینک اور پھر فوجیں خلیج میں تسلط قائم کیے ہوئے ہیں۔ اس سے بڑا ظلم یہ ہے کہ تیل نکالنے، صاف کرنے اور مارکیٹنگ کی صلاحیت آج بھی ہم میں موجود نہیں ہے اور مغرب کے ارادے یہ ہیں کہ ابھی امریکی وزارت دفاع پینٹاگون میں یہ دھمکی دی گئی ہے کہ اگر سعودی عرب نے امریکی احکامات کی من وعن تابع داری نہ کی تو اس کے تیل کے چشموں پر قبضہ کر لیا جائے گا اور مغربی ملکوں میں اس کے اثاثے

اور مغربی بینکوں میں اس کے اکاؤنٹس ضبط کر لیے جائیں گے۔

اس لیے ہمیں اس کی تکلیف زیادہ ہے اور ہم اس کا درد زیادہ محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اس پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنا چاہیے اور میں ہر اس شخص کو جس کے دل میں انصاف کی ایک رتی بھی موجود ہے اور ضمیر نام کی کوئی چیز وہ اپنے پاس رکھتا ہے، دعوت دیتا ہوں کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ اس بات کا جائزہ لے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں امت کی محرومی کا ذمہ دار کون ہے؟

میں تاریخ کے حوالے سے بات کروں گا۔ جب ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز حکمرانوں نے ہمارا پورا نظام تلپٹ کر دیا تھا، دینی مدارس ختم کر دیے تھے، نظام تعلیم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا اور ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی تھی تب دو طبقے سامنے آئے تھے اور انہوں نے ملت کو سہارا دیا تھا۔ دونوں نے الگ الگ شعبوں کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ علمائے کرام نے قرآن وسنت کی تعلیم کو باقی رکھنے کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی اور اسلامی ثقافت اور تہذیب کے تحفظ کا وعدہ کیا تھا۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے عوام سے تعاون کے لیے رجوع کیا، چندے مانگے، گھر گھر دستک دے کر روٹیاں مانگیں، زکوٰۃ وصدقہ کے لیے دست سوال دراز کیا اور سرکاری تعاون سے بے نیاز ہو کر عوامی تعاون کے ساتھ قرآن وسنت کی تعلیم کو باقی رکھنے اور اسلامی تہذیب وثقافت کے آثار کو بچانے کے لیے کردار ادا کیا۔ انہوں نے ایک ایک دروازے پر دستک دی، سر پر چنگیر رکھ کر گھر گھر سے روٹیاں مانگیں، ہاں ہاں میں نے خود روٹیاں مانگی ہیں، اور مجھے اس پر فخر ہے۔ میں نے اپنی طالب علمی کے دور میں گوجرانوالہ کے کئی محلوں میں سر پر چھابہ رکھ کر روٹیاں مانگی ہیں۔ ہم نے اپنی عزت نفس کی پروا نہیں کی، طعنے سنے ہیں، بے عزتی برداشت کی ہے لیکن قرآن وسنت کی تعلیم کو باقی رکھا ہے جس کی گواہی آج دشمن بھی دے رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور طبقہ سامنے آیا جس نے قوم کو جدید علوم سے بہرہ ور کرنے کی ذمہ داری قبول کی، سائنس اور ٹیکنالوجی پڑھانے کا وعدہ کیا، انگریزی اور جدید زبانوں کی تعلیم اپنے ذمے لی۔ انہیں اس کام کے لیے ریاستی مشینری کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی اور انہوں نے قومی خزانے کے کھربوں روپے خرچ کر ڈالے۔ انہیں سرکاری وسائل میسر تھے، ریاستی پشت پناہی حاصل تھی لیکن وہ قوم کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں آج کی قوموں کے برابر نہ لا سکے اور آج اپنی ناکامی کی ذمہ داری مولوی کے سر تھوپ کر اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں آج کی اجتماعی دانش سے سوال کرتا ہوں کہ وہ انصاف سے کام لے اور یہ فیصلہ کرے کہ نااہل کون ثابت ہوا اور اپنی ذمہ داری کس نے پوری نہیں کی؟ آج اگر ملک کے کسی گوشے میں دینی تعلیم کا انتظام نہیں ہے، قرآن وسنت کی راہ نمائی لوگوں کو میسر نہیں ہے اور اسلام کی آواز نہیں لگ رہی تو ہم مجرم ہیں لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں سے پیچھے رہنے کی ذمہ داری ہم پر نہ ڈالیے۔ یہ ناانصافی ہے۔ اس کے بارے میں ان سے پوچھیے جنہوں نے اس کی ذمہ داری قبول کی تھی اور اس کے لیے سرکاری خزانے کے کھربوں روپے اب تک انہوں نے خرچ کر ڈالے ہیں۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کو مساجد میں نماز پڑھانے کے لیے امام میسر ہیں؟ قرآن کریم کی تعلیم کے لیے قاری مل رہے ہیں؟ رمضان میں قرآن سنانے کے لیے حافظ مل جاتے ہیں؟ جمعہ پڑھانے کے لیے خطیب موجود ہیں؟ مسئلہ بتانے والے مفتی صاحبان کی کمی تو نہیں؟ دینی راہ نمائی دینے کے لیے علمائے کرام سے ملک کا کوئی گوشہ خالی تو نہیں؟ اس سے اگلی بات کہ میدان جنگ میں کفر کے خلاف صف آرا ہونے والے مجاہدین بھی ان مدارس سے آپ کو مل رہے ہیں یا نہیں؟ اگر یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو دینی مدارس پر اعتراض کس بات کا ہے؟

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی آج ہی ایک محفل میں فرما رہے تھے کہ انہوں نے وفاقی وزرا سے کہا ہے کہ سرکاری نصاب تعلیم اور نظام کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قومی کمیشن قائم کیجیے اور ہمیں اور سرکاری تعلیم کے ذمہ داروں کو اس کے سامنے پیش کیجیے۔ ساری حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔'' (روزنامہ جنگ ۲۷ دسمبر ۲۰۰۲ء)۔

☆☆☆

نقد و نظر

# عقلِ کل کا ماتم

ابوفہد

مولانا وحیدالدین خان نے ایک جگہ لکھا ہے:

**اتھارٹی صرف ایک:**

حدیث کی کتابوں میں ایک لمبی روایت آئی ہے، جس کا ایک حصہ یہ ہے: لو کان موسی حیا ما وسعہ الا اتباعی – (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر 147) یعنی اگر موسی زندہ ہوتے تو ان کے لیے اس کے سوا کچھ اور جائز نہ ہوتا کہ وہ میری اتباع کریں – اس حدیث کو علماء نے عام طور پر فضیلت رسول کے معنی میں لیا ہے، مگر یہ درست نہیں – فضیلت انبیاء کا تصور قرآن و حدیث سے ٹکراتا ہے – قرآن میں آیا ہے کہ لا نفرق بین أحد من رسلہ (285:2) یعنی ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے: لا تفضلوا بین انبیاء اللہ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3414) یعنی اللہ کے پیغمبروں کے درمیان ایک کو دوسرے پر فضیلت نہ دو –

اصل یہ ہے کہ اوپر مذکور حدیث میں شخصی فضیلت کا ذکر نہیں، اس میں ایک عام اصول بتایا گیا ہے – وہ یہ کہ اتھاریٹی ہمیشہ ناقابل تقسیم ہوتی ہے – نظم کا تقاضا ہے کہ اتھاریٹی صرف ایک ہو – جہاں بھی اتھاریٹی دو یا دو سے زیادہ ہو گی، نظم (descipline) قائم نہ رہے گا – حضرت موسی کے زمانے میں دو پیغمبر تھے، موسی اور ہارون – لیکن اتھاریٹی کی حیثیت صرف موسی کی تھی، ہارون کو نہ تھی – حضرت ہارون کا کام حضرت موسی کی تصدیق کرنا تھا۔ (34:28)

تفضیل انبیاء کا عقیدہ بلاشبہ قرآن اور حدیث میں اجنبی ہے – انبیاء کے درمیان ایک فرق پایا جاتا ہے – یہ فرق رول کے اعتبار سے ہے، نہ کہ فضیلت کے اعتبار سے – اس پہلو سے ہر پیغمبر نمونہ ہے – آدمی کو چاہئے کہ وہ مختلف پیغمبروں کے حالات کا مطالعہ کرے – جس پیغمبر میں اس کو اپنے حالات کے اعتبار سے مطابقت ملے، اس کو وہ اپنا لے – یہ پیروی طریق کار (method) کے اعتبار سے ہے – جہاں تک عقیدہ اور اصول دین کا سوال ہے، تمام پیغمبروں کا عقیدہ اور اصول دین ایک تھا – الرسالہ، جنوری 2016 مولانا وحیدالدین خان)

یہ تحریر شاید ابھی حال فی الحال ہی میں لکھی گئی ہے اور جنوری 2016 کے الرسالہ میں شامل ہے۔ اس تحریر کو پڑھنے سے دو بڑے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ جب اتھاریٹی ناقابل تقسیم ہوتی ہے اور ایک وقت میں ایک ہی پیغمبر کو اتھاریٹی حاصل ہوگی، چاہے ایک ہی وقت میں دو یا دو سے زائد پیغمبر موجود ہوں جیسا کہ مولانا نے لکھا ہے: ۔۔۔۔ ''اتھاریٹی ہمیشہ ناقابل تقسیم ہوتی ہے – نظم کا تقاضا ہے کہ اتھاریٹی صرف ایک ہو – جہاں بھی اتھاریٹی دو یا دو سے زیادہ ہوگی، نظم (descipline) قائم نہ رہے گا'' ۔۔۔۔۔ تو پھر نبیؐ کے بعد کے زمانے میں یہ اتھاریٹی

قابل تقسیم کیونکر ہوسکتی ہے۔اور ایسا کیسے ممکن ہے کہ آدمی جس پیغمبر کی جس بات کو چاہے اپنالے اور جس کی چاہے اقتدا کرے۔؟؟ اسی تحریر کے آخر میں مولانا فرماتے ہیں:۔۔۔۔ ''اس پہلو سے ہر پیغمبر نمونہ ہے- آدمی کو چاہئے کہ وہ مختلف پیغمبروں کے حالات کا مطالعہ کرے-جس پیغمبر میں اس کو اپنے حالات کے اعتبار سے مطابقت ملے ، اس کو وہ اپنا لے''۔۔۔اس آخری بات سے اتھاریٹی کی دوئی لازم آتی ہے۔جس کی ابتدا میں نفی کی گئی تھی۔اور اس طرح اس تحریر میں تضاد در آیا ہے۔اس طرف مولانا کی نظر نہیں گئی۔تعجب ہے کہ مولانا کو یہ تو منظور نہیں کہ جس زمانے میں بیک وقت دو پیغمبر (حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام) موجود ہوں، بیک وقت دونوں کو اتھاریٹی حاصل ہو مگر مولانا کو یہ منظور ہے بلکہ مطلوب ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں (جو آپ کی بعثت سے لے کر قیامت تک کا زمانہ ہے، کیونکہ اب کوئی اور نبی نہیں آنے والا اور شریعت محمدی ماقبل کی تمام شریعتوں کی ناسخ ہے، ماسوا ان تعلیمات کے جو اسلامی شریعت میں باقی رکھی گئیں) تمام پیغمبروں کو یکساں طور پر اتھاریٹی حاصل رہے۔اور ہر مسلمان اپنے من مطابق جس کی چاہے اقتدا کرے۔

اور دوسرا بڑا سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں جب سابق انبیاء کی تعلیمات غیر محفوظ ہیں ، ان کی تعلیمات میں ان کے ماننے والوں نے بہت سے اضافے کردئے ہیں۔عیسائیت کے بارے میں مائکل ہارٹ نے لکھا ہے:''سینٹ پال نے ہی صحیح معنیٰ میں الٰہیات کی ترویج میں حقیقی پیش رفت کی، اس نے عیسائی پیروکاروں میں اضافہ بھی کیا اور وہ عہد نامہ جدید کے ایک بڑے حصے کا مصنف بھی ہے (سو عظیم آدمی ،صفحہ 28، مصنف مائکل ہارٹ، مترجم: محمد عاصم بٹ)۔۔تو ایسے میں کسی مسلمان کے لیے کتنی گنجائش رہ جاتی ہے کہ وہ نبیِ آخر الزماں ﷺ کی محفوظ اور غیر مشکوک تعلیم کو چھوڑ کر کسی دوسرے پیغمبر کی غیر محفوظ اور مشکوک تعلیمات کو اپنالے۔اور رہی بات ان تعلیمات کی جو ہمیں قرآن وحدیث میں ملتی ہیں یا قرآن وحدیث سے ان کی تائید ہوتی ہے تو انہیں اپنانا تو اسلامی تعلیمات کو ہی اپنانا ہے، انہیں اپنانے میں اسوۂ محمد ﷺ کو چھوڑنا لازم نہیں آتا۔

دراصل مولانا کی یہ تحریر ان کی اس تحریر کا تائیدی بیان ہے جس میں مولانا نے نبیؐ کے ''اسوۂ حسنہ'' کو اسوۂ کاملہ ماننے سے انکار کیا تھا۔انہوں نے لکھا تھا:''اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ تاریخ میں ایسی تبدیلیاں واقع ہوں گی کہ محمدی ماڈل زمانی حالات کی نسبت سے، جزئی طور پر، قابل انطباق (applicable) نہ رہے گا، اس کے بجائے مسیحی ماڈل جزئی طور پر قابل انطباق بن جائے گا۔(الرسالہ: جون 2007 صفحہ 3:) یہ وضاحت سورہ الصف آیت نمبر 14 کی روشنی میں کی گئی ہے ان کا ماننا ہے کہ اس آیت میں واضح طور پر پیروانِ محمد کو پیروانِ مسیح کے ماڈل کو اپنانے کا حکم دیا گیا ہے۔وہ لکھتے ہیں: ''اس آیت کا اسلوب ایک غیر معمولی اسلوب ہے۔اس لیے کہ اس آیت میں واضح طور پر پیروانِ محمد کو پیروانِ مسیح کے ماڈل کو اپنانے کا حکم دیا گیا ہے'' یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ مولانا کو یہ صریح حکم براہ راست اس آیت کے الفاظ سے نہیں ملا بلکہ اس کے ''غیر معمولی اسلوب'' سے ملا ہے۔واضح رہے ''مسیحی ماڈل کی آمد ثانی'' میں پوری بحث قرآنی آیات کے اسلوب سے کی گئی ہے۔غالبا یہ مسلم تاریخ کے واحد ایسے ذی فہم انسان ہیں جو قرآن کی کسی آیت کے محض اسلوب (نہ کے الفاظ) سے ''واضح حکم'' بھی نکال سکتے ہیں۔اور ایسا حکم بھی نکال سکتے ہیں جو چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں اجنبیِ محض ہو اور جس کی تائید کسی دوسرے نقلی یا عقلی ماخذ سے نہ ہوتی ہو۔

مولانا کو یہ لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہ دیکھ اور

جان رہے ہیں کہ محمد ﷺ کی سیرت تو غزوات وسرایا سے بھری پڑی ہے اوران کے مزاج کو یہ بات راس نہیں آتی کہ ایک پیغمبر دعوت کے علاوہ جہاد بھی کرے۔ اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

''پیغمبر اسلام کا ماڈل یہ ہے کہ آپ نے مکہ میں اپنے دعوتی مشن کا آغاز کیا۔ اس کے بعد مخاطبین کی طرف سے سخت مخالفت پیش آئی۔ اس کے بعد مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کو اپنا مستقر بنایا۔

اب مخالفین کی طرف سے حملے کیے گیے۔ اس کے نتیجے میں دفاعی جنگ پیش آئی۔ اس کے بعد آپ نے اپنے حریفوں سے وہ صلح کی جو اسلام کی تاریخ میں 'صلح حدیبیہ' کے نام سے مشہور ہے۔ آخر میں فتح مکہ کا واقعہ پیش آیا اور پھر عرب میں آپ کا اقتدار قائم ہوگیا۔ اس کے مقابلے میں مسیح کے ماڈل میں آغاز میں بھی دعوت ہے اور انجام میں بھی دعوت۔ مسیح کے دعوتی ماڈل میں ہجرت اور جہاد (بہ معنیٰ قتال) کے واقعات موجود نہیں۔ محمدی ماڈل میں ہجرت اور جنگ اُس کے واضح اجزا کے طور پر شامل ہیں۔''

یہ ہے وہ اصل وجہ جس نے مولانا کو اتنا سب بکھیڑا کھیڑا کرنے پر مجبور کیا۔ یہاں تک کہ محمدی ماڈل پر مسیحی ماڈل کو جزوی طور پر ترجیح دینی پڑی۔ اور ہاں ''محمدی ماڈل زمانی حالات کی نسبت سے، جزئی طور پر، قابل انطباق (applicable) نہ رہے گا، اس کے بجائے مسیحی ماڈل جزئی طور پر قابل انطباق بن جائے گا'' مولانا کے اس فرمان میں ''جزئی'' کے لفظ سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔ کیونکہ اس میں نسبت زمانے کی طرف ہے۔ 'جزئی طور' کا مطلب ہوگا 'وقتی طور پر' اور چونکہ اب ایسا وقت نہیں آنے والا جس میں جہاد بہ معنیٰ قتال اور ہجرت کی ضرورت پیش آئے۔ اس لیے اب ہمیشہ کے لیے مسیحی ماڈل ہی قابل انطباق رہے گا اور محمدی ماڈل ہمیشہ کے لیے نا قابل انطباق ہی بنا رہے گا۔ اس کے اثبات کے لیے مولانا ہی کے الفاظ پڑھ لیجئے، اسی مضمون ''مسیحی ماڈل کی آمد ثانی'' کے آخر میں لکھتے ہیں: ''..اب حالات نے ہجرت اور جنگ کو نا قابلِ عمل بنا دیا ہے۔ اب ساری دنیا میں ماڈرن نیشنل ازم کا زمانہ ہے۔ ہر ملک میں نیشنل حکومتیں قائم ہیں۔ ماڈرن نیشنل ازم نے اب ہجرت جیسے کسی طریقے کو عملی طور پر ناممکن بنا دیا ہے۔ یہی معاملہ جنگ کا ہے... اب جنگ کا انتخاب صرف ایک دیوانگی کا فعل ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔''

اور اب چونکہ زمانہ ایک بار پھر سے غیر ماڈرن نہیں ہونے والا اس لئے جہاد اور ہجرت کی ضرورت بھی پیش نہیں آنے والی اور اس طرح محمدی ماڈل بھی کبھی قابل انطباق نہیں ہونے والا۔ پتہ نہیں اپنے اس قول میں بھی یہ کہاں تک سچے ہیں۔ ہم تو یہی دیکھ رہے ہی کہ جنگیں اب بھی ہو رہی ہیں اور پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک اور بھیانک طریقے پر ہو رہی ہیں۔ اور جن حکومتوں کو یہ ماڈرن نیشنل حکومتیں فرما رہے ہیں وہی سب سے زیادہ آمادۂ جنگ ہیں۔ انہوں نے دنیا کو بارود کے ڈھیر پر کھڑا کر دیا ہے۔

مولانا کے فکر ور جحان کی بنیاد کی خشتِ اول جہاد بہ معنیٰ قتال اور اسلامی حکومت کی نفی پر قائم ہے، انہوں نے اب تک جتنا کچھ بھی لکھا اور کہا ہے سب کا سب انہیں دونوں چیزوں کی نفی سے شروع ہو کر انہیں کی نفی پر ختم ہو جاتا ہے۔ ہاں اس نفیِ مسلسل میں 'دعوت' کے اثبات کا نزکہ ضرور ہے۔ جو ان کے یہاں کل اسلام کی صورت میں جلوہ گر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ جو شخص قرآن وحدیث کو مانتا ہے وہ اسلام میں جہاد بہ معنیٰ قتال اور حکومت کے تصور کو سرے سے خارج نہیں کر سکتا ہے۔ البتہ اسلامی حکومت کے قیام کی حکمتِ عملی اور نوعیت پر اور معاصر دنیا اور وقت کے ساتھ جہاد بہ معنیٰ قتال کی فرضیت کی تطبیق اور عدم تطبیق پر کلام ضرور کر سکتا ہے۔

اور یہ ان کے اسی مزاج کا شاخسانہ ہے کہ انہوں نے حضور ؟ کی زندگی کو مکی ماڈل اور مدنی ماڈل میں تقسیم کر ڈالا اور مکی زندگی کو مدنی زندگی پر فوقیت دی کیونکہ مکے میں آپ ﷺ کے لیے لڑنے کی ممانعت تھی اور مدینے میں آپ ﷺ کو لڑائی کی بلکہ صحیح معنیٰ میں جوابی کارروائی کی اجازت دی گئی۔ اور یہ چیز کہ دعوت کے ساتھ ساتھ جہاد بھی کیا جائے مولانا کے طریق دعوت کے

خلاف ہے، اب چاہے ایسا اللہ کا حکم ہی کیوں نہ ہو اور چاہے ایسا نبی آخر الزماں ﷺ نے جوابی کارروائی اور ردعمل کے طور پر ہی کیو ں نہ کیا ہو۔ چونکہ یہ چیز ان کے طریق دعوت، مزاج اور افتادِ طبع کے خلاف ہے اس لیے وہ غلط ہے۔

گرچہ انہیں اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی سمجھ کے مطابق (اگر وہ اللہ کی کتاب اور عامۃ المسلمین کے لیے مخلص ہیں) کسی آیت کا کوئی مفہوم بیان کریں مگر انہیں اصرار کا حق نہیں۔ مگر وہ اصرار کرتے ہیں اور اپنے اصرار کو یہ کہہ کر مؤکد کرتے ہیں کہ جو علماء تفضیل انبیاء کے قائل ہیں وہ غلط ہیں ان کے خیال میں تِلكَ الرُّسُلُ فَضَّلنَا بَعضَهُم عَلَىٰ بَعضٍ البقرۃ:۲۵۳۔ میں تائیدی فضیلت ہے نہ کہ مطلق فضیلت۔ ان کے خیال میں اس فضیلت کو مطلق فضیلت ماننا فتنے کا سبب ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ از اول تا آخر عرب وعجم کے تمام علماء تفضیل انبیاء کے قائل رہے ہیں۔ کیونکہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر 253 اور سورہ بنی اسرائی کی آیت نمبر 55 سے فضیلت ثابت ہوتی ہے اور جہاں تک سورہ بقرہ کی آیت نمبر 285 اور صحیح البخاری کی حدیث نمبر 3414 کا سوال ہے جن میں تفضیل انبیاء کی ممانعت ہے تو اس کی یہ توجیہ بیان کی گئی ہے کہ ممانعت ایمان کی بنیاد اور سطح پر ہے۔ یعنی مومنین کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ تمام انبیاء پر ایمان لائیں، یہود ونصاریٰ کی طرح ایسا نہ کریں کہ کچھ انبیاء کو مانیں اور کچھ کو نہ مانیں۔

جمہور علماء اور مفسرین نے تو یہ کیا کہ تفضیل انبیاء والی آیات کی بنیاد پر فضیلت بین الرسل کو ثابت کیا اور قرآن کی جس آیت میں اور بخاری کی جس حدیث میں تفریق نہ کرنے کی بات ہے اس کی توجیہ کی جبکہ مولانا وحید الدین خان صاحب نے اس کا الٹ کیا۔ انہوں نے انبیاء کے درمیان تفریق نہ کرنے والے حکم کو لے لیا اور دوسری آیت خاص کر سورہ بقرہ کی آیت 253 کی یہ کہہ کر توجیہہ کر ڈالی کہ یہ فضیلت تائیدی ہے نہ مطلق فضیلت۔

یہاں یہ بھی دلچسپ بات ہوسکتی ہے کہ مولانا کے ذہن کو ''تائیدی فضیلت اور مطلق فضیلت'' کی تقسیم کا اشارہ شاید اسی آیت کے الفاظ (وأيدناه بروح القدس) سے ملا ہوگا۔ خیر یہ تو ایک قیاسی بات ہے اور مجھے اس سے کچھ زیادہ سروکار نہیں۔

شاید یہ بات آپ کو تعجب خیز معلوم ہو کہ حضور ﷺ کی جن صفات کو دنیا کے قد آور سیاسی اور مذہبی رہنماؤں نے اعلیٰ صفات مانا ہے اور جن کی بنیاد پر آپ ﷺ کو دنیا کی سب سے عظیم ہستی قرار دیا ہے مولانا کی نظر میں آپ ﷺ کی وہی صفات دیگر صفات کے تقابل میں فروتر ہیں بلکہ وہ اس لائق ہیں کہ انہیں بطور اسوہ قبول نہ کیا جائے۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے سیاسی لیڈر، قانون داں، منصف، ادیب اور تاریخ داں اگر حضور ﷺ کو دنیا کا سب سے عظیم اور سب سے بااثر انسان مانتے ہیں تو اس کی وجہ آپ ﷺ کی ہمہ جہت اور ہشت پہلو شخصیت ہی ہے۔ آپ ﷺ ایک بہترین معلم بھی ہیں، مدبر ومفکر بھی ہیں، قانون ساز بھی ہیں، میدان اخلاق کے پیغمبر بھی ہیں اور میدانِ جنگ کے سپہ سالار بھی، آپ ﷺ لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے والے بھی ہیں اور مختلف قوموں اور حکومتوں کے درمیان سفارتی تعلقات کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ نبھانے والے بھی ہیں۔ ذرا سوچیں کہ اگر آپ ﷺ صرف اور صرف لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے والے ہوتے اور صرف دعوت دیتے دیتے ہی دنیا سے رخصت ہوجاتے تو کیا آپ ﷺ کی ہمہ جہت اور شش پہلو والی امیج بن پاتی اور کیا آپ ﷺ کی شخصیت میں دنیا کے ذہین ترین افراد کے لئے وہی کشش ہوتی جو آج ہے۔ مگر اس کا کیا جائے کہ مولانا کو تو بس ایسے پیغمبر اسلام کی ضرورت ہے جسکی عملی زندگی دعوت سے شروع ہوکر دعوت پر ہی ختم ہوجائے۔

''مسیحی ماڈل کی آمدِ ثانی'' کا مطالعہ کرنے کے لیے درج ذیل لنک پر جائیں۔ http://www.cpsglobal.org/sites/default/files/June%202007.pdf

☆☆☆

نقد ونظر

# منکر مھدی راشد شاذ

مفتی اسعد قاسم سنبھلی
ناظم جامعہ شاہ ولی اللہ مرادآباد Mob:9528010792

روات کی کثرت، احادیث کی صحت اور خیر القرون کی متواتر شہادت کی بناء پر ظہور مہدی کا مسئلہ امت کے نزدیک اجماعی رہا اور اس میں صدیوں تک کسی بھی معتبر شخصیت نے اختلاف پیدا نہیں کیا تا آنکہ آٹھویں صدی ہجری میں امام ابن خلدون کی شخصیت منظر عام پر آئی اور انھوں نے اپنی مشہور تاریخ میں جہاں بہت سے موضوعات پر خامہ فرسائی کی وہیں ردعمل کا شکار ہوکر موصوف نے ظہور مہدی کا بھی انکار کرڈالا اور مسئلہ میں اتنا تشدد برتا کہ بعض احادیث کو صحیح تسلیم کرنے کے باوجود وہ خروج مہدی کا انکار ہی کرتے رہے۔ یہ تاریخ کا ایک انقلابی موڑ تھا اور امام ابن خلدون کی جلالت وعظمت کے پیش نظر اندیشہ تھا کہ ملت کا اجماعی موقف متاثر ہو اور کوئی طبقہ اس منفی فکر کو تحریک بنالے لیکن تاریخ یہ شہادت دیکر قارئین کو حیران کر دیتی ہے کہ امام کے تفردات کا امت پر کوئی اثر نہ ہوا اور آٹھویں صدی ہجری ہی کے ایک جید عالم نے **"ابراز الوھم المکنون فی کلام ابن خلدون"** کے عنوان سے ایک علمی تردید لکھ کر انکار مہدی کے غبارے کی ہوا نکال دی اور ماضی کی طرح یہ مسئلہ پھر اجماعیت کی سطح پر آ گیا۔

امام ابن خلدون کے بعد صدیوں تک کسی مستند عالم نے مہدی کا انکار نہیں کیا اس لئے موصوف کا موقف بھی بس اسلامی کتب خانہ تک محدود رہا اور علماء نے اس پر زیادہ خامہ فرسائی کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن جب ہندوستان میں عالیجناب سرسید نے ظہور مہدی کا انکار کرنے کیلئے ابن خلدون کا سہارا لیا تو اہل علم وفضل کی صفوں میں ارتعاش پیدا ہوا اور انھوں نے آٹھویں صدی کی اس لغزش کا بھرپور تعاقب کر کے ظہور مہدی پر ایسے طاقتور دلائل دیئے جنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو مطمئن کر دیا اور انکار کا نظریہ پھر حاشیہ پر جا پڑا۔ قارئین یہ تمام بحثیں راقم سطور کی معروف ومقبول کتاب ''امام مہدی ------ شخصیت و حقیقت'' کے باب دوم کی دوسری فصل میں پڑھ سکتے ہیں۔ خصوصاً حضرت تھانوی کا رسالہ **مواخذة الظنون عن کلام ابن خلدون** تو اس باب میں اس وقدر وقیع اور مفید ہے کہ اس نے علمی سطح پر ابن خلدون کے تمام دعوے توڑ ڈالے اور سرسید کیلئے استدلال کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی، ہم سمجھتے ہیں کہ حضرت تھانوی اگر کچھ بھی نہ لکھتے اور ان کی صرف یہی ایک تصنیف ہوتی تب بھی وہ حکیم الامت اور مجدد ملت کہلاتے اور ان کی موجودہ عظمت میں کوئی ادنیٰ بھی فرق نہ آتا۔

الغرض حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی، علامہ جعفر کتانی، مولانا شمس الحق عظیم آبادی اور دیگر عبقری علماء نے بروقت مدلل تنقید کر کے ظہور مہدی کو دوبارہ

اجماعیت عطا کی اور امت اپنے قدیم عقیدے پر اس طرح قائم رہی کہ پھر احمد امین مصری کی **ضحی الاسلام**، سعد محمد حسن کی **المهدية في الاسلام** اور وحید الدین خاں صاحب کی انکاری تحریریں بھی اس پر اثر انداز نہ ہوسکیں۔

ظہور مہدی کے باب میں علماء حق کے علمی معرکوں نے منکرین مہدی کو ہلا کر رکھ دیا اس لئے عصر حاضر کے متجددین (Modernate Muslim) نے یا تو سرے سے اس جوکھم کو اٹھانے کی ہمت ہی نہیں کی یا پھر اپنے شکوک و شبہات کے اظہار پر اکتفا کیا اور انکار مہدی کا کوئی محاذ بنانے سے وہ عملاً گریز کرتے رہے لیکن ادھر کچھ عرصہ سے ڈاکٹر راشد شاذ کی بابت مسلسل یہ آوازیں کانوں میں آرہی ہیں کہ وہ اپنی کتابوں میں بے دھڑک مہدی کا انکار کررہے ہیں، مولانا وحید الدین خاں کی طرح یہ موصوف بھی کیونکہ آوارہ ذہن، تیز قلم اور باطل نظاموں سے بری طرح مرعوب ہیں اس لئے اپنے ملحدانہ نظریات کو تعمیر و تجدید کے جامے میں پیش کر رہے ہیں اور متقدمین و متاخرین تمام علماء ان کے نزدیک بچوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ واقعہ یہی ہے کہ راشد شاذ نہ صرف امت کی عظیم شخصیات بلکہ اس کے سواد اعظم کو اپنے نشانے پر رکھتے ہیں، یہی نہیں بلکہ ادلۂ شرعیہ بھی ان کی جنونی تنقید سے محفوظ نہیں رہ جاتیں، ان کی تصنیفات کا مطالعہ کرنے والے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کی یہ حرکت کس قدر بچکانہ ہے، عام طور پر وہ شخصیات سے بیر رکھتے ہیں، شکوک وشبہات سے بالا کسی کو نہیں سمجھتے لیکن جہاں مطلب نکالنا ہو وہاں بڑے طمطراق سے ان ہی شخصیات کے اقوال کا سہارا لیتے ہیں، ''اجماع'' کو وہ ''دھونس'' قرار دیتے ہیں تو پھر ائمہ وعلماء کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے، یہ بات سمجھنے کی ہے کہ شاذ جیسی شخصیات کا اپنا کچھ بھی نہیں، یہ وہ افراد ہیں جو مستشرقین کے شاگرد اور مسلم نام کے ساتھ استشراق کے علمبردار ہیں،، ان کی تحریر وتحریک مفاد و موقع پرستی سے عبارت ہوتی، حیات شاذ کے واقف کاران کے دور اول اور دور ثانی سے بھی اس کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں۔

یہ ایک پسماندہ ریاست کے پسماندہ گھرانہ میں پیدا ہوئے، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعلیم بڑی کسمپرسی میں حاصل کی، لیکن معلوم نہیں پھر اچانک کیا ہوا ان کے پاس وسائل کی بہتات ہوگئی اور عوامی حلقوں میں یہ نام غالباً اس وقت منظر عام پر آیا جب بوسنیا ہرزی گووینا میں صلیبیوں نے مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑ دیئے اس وقت ملت کے تمام طبقوں نے احتجاج کیا، لیکن راشد شاذ صاحب کا احتجاج بالکل الگ نوعیت کا تھا، اس میں نہ صرف مسلح جدو جہد کا عزم تھا بلکہ کھلی بھرتی کیلئے انھوں نے اپنے دفتروں کے پتے بھی دیئے تھے اور **انفرو خفافا و ثقالاً** (نکل پڑو خواہ ہلکے ہو یا بھاری) کی ہلا دینے والی للکار و پکار سے اردو کے اخبارات بھر ڈالے تھے، واقعی شاذ صاحب کے تضادات قابل غور ہیں، ایک زمانہ وہ تھا جب ان کی للکار مسلح جہاد کی تھی اور ایک زمانہ یہ ہے کہ اب وہ امن کے پیامبر ہیں، دیگر مسلح تحریکات کی بابت کیا عرض کرنا، فلسطینی جہاد جو ملت اسلامیہ کے متفقہ عقیدہ کا جزء ہے، اس کی بابت وہ مسجد اقصی کا نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ مسلمانوں کو اپنے دعوے سے دستبردار ہونے کا حق دیتے ہیں، ایک زمانہ تھا جب وہ خلافت علی منہاج النبوہ کا غلغلہ بلند کررہے تھے اور اس ملک جمہوریت کے چلن کی (دارالعید کے پس منظر میں) تعریف کرنے والوں کو مشرک قرار دے رہے تھے اور آج وہ جمہوریت کے سب سے بڑے علمبردار ہیں، کسی جانب سے اگر ان کے کان میں خلافت کے قیام کی آواز بھی پڑ جائے تو تڑپ اٹھتے ہیں اور اسے قتل وخون کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ شاذ صاحب کی تحریریں تضادات کا مجموعہ ہیں، اور اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے افکار کو تحریر کا جامہ نہیں عطا کیا ہے، بلکہ موقع پرستی کے

نظریہ پر عمل کرتے ہوئے متعدد ملغوبوں کو مجموعۂ تحریر بنایا ہے، یہی وجہ ہے منصف مزاج قاری ان کی تحریروں کے تضادات سے ڈھول کے پول کا پتہ پاتا ہے جسے وہ بڑی آسانی سے روایت پرستی کا نام دیتے ہیں۔لیکن ان تمام خلاف ورزیوں کے باوجود ہم نے کہیں اخباروں میں نہیں پڑھا کہ خفیہ ایجنسیوں نے اس کا کوئی نوٹس لیا یا سول انتظامیہ نے ان کے خلاف کوئی رپورٹ درج کی، ہماری معلومات کی حد تک یہ اتنے طوفان اٹھا کر بھی آزاد بھارت کے آزاد شہری رہے، حالانکہ قارئین اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے پرامن احتجاج پر بھی پولس کا ردعمل کیا ہوتا ہے اور نمایاں حضرات تو برسوں تک پھر جیل یا کچہری کے چکر لگاتے ہیں۔

بوسنیا کے سانحہ سے پہلے یا بعد میں موصوف کے ذہن میں ملی قیادت کا سودا سمایا تو انھوں نے سیاست کی دنیا میں ایسا قدم اٹھایا جس کی ہمت تقسیم ہند کے بعد کوئی بڑے سے بڑا مسلم قائد بھی نہ کر سکا انھوں نے بھارتی پارلیمنٹ کے طرز پر کھلم کھلا ایک متوازی ملی پارلیمنٹ بناڈالی اور سینکڑوں طالع آزماؤں کو ایم پی کے تمغے بھی تقسیم کر دیئے، ہماری معلومات کی حد تک حکومت نے اس وقت بھی کوئی خاص نوٹس نہیں لیا اور یہ ڈپٹی اسپیکر کی طرح پورے ملک میں گھومتے رہے حالانکہ قارئین جانتے ہیں کہ بھارتی حکومتیں اسلام کی نظامی تعبیر کے تئیں کتنی حساس رہی ہیں اور انھوں نے دارالقضاؤں کی تمام تر احتیاط کے باوجود آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کو نوٹس تک بھیجے ہیں، آج یہ پارلیمنٹ بس اوکھلا ٹاور کی حیثیت سے جانی جاتی ہے اور ملی قیادت کے تمام دعوے ٹائیں ٹائیں فش ہو چکے ہیں۔

بوسنیا میں خیالی گھوڑے دوڑانے اور ملی قیادت کا خواب بکھرنے کے بعد موصوف نے کچھ گمراہ کن کتابیں لکھ کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ دور حاضر کے ایسے عظیم مفکر ہیں جس کی نظیر گزشتہ صدیوں میں بھی ڈھونڈے سے نہ ملے گی اور عصر حاضر میں بس انھیں کی اقتداء کر کے امت تمام مسائل سے نجات پا سکتی ہے حالانکہ یہ تحقیق کے نام پر تشکیک کا فریضہ انجام دینے والا شخص ہے اور اس کے بیرونی دورے، خفیہ ملاقاتیں اور خطرناک عزائم ملت کے بہی خواہوں کو ہمیشہ تشویش میں مبتلا کرتے رہے ہیں، لیکن افسوس اس انہدامی فکر کے باوجود علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی انتظامیہ نے معلوم نہیں کس کے اشارہ پر راشد شاذ کو آناً فاناً تدریس کے عظیم منصب پر لا بٹھایا تاکہ یہ برج کورس کے ذریعہ عربی مدارس کے نوآموز فضلاء کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے انکار کا فن سکھائے اور ملت میں مزید انتشار پیدا کرے۔

ہم نے ڈاکٹر راشد شاذ کی تحریریں پڑھی ہیں، ہمارا خیال ہے کہ جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر ان کی کتابیں پڑھے گا وہ یقینی طور پر یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوگا کہ ان تصنیفات کا مؤلف بڑا ہی رعونت بھرا مزاج رکھتا ہے، اسی لئے وہ بے دھڑک حضرت عیسیٰ کے نزول، دجال کے خروج اور مہدی کے ظہور کا انکار کر ڈالتا ہے، حالانکہ یہ تمام تر عقائد مضبوط دلائل سے ثابت ہیں، اس طبقہ کے لوگ ان دلائل کو ہی مشکوک بنانے کی فیکٹری لگاتے ہیں جن سے ان مسائل کا استنباط ہوتا ہے، جب دلائل مشکوک قرار دے دیے جائیں تو پھر مذکورہ حقائق کیا تمام مسائل مشکوک قرار پاتے ہیں اور ان کو ٹھیکہ ہی دیا گیا ہے امت میں تشکیکی مزاج تشکیل دینے کا، ذخیرۂ حدیث، رواۃ حدیث پر زمانۂ تدوین میں اس قدر کام ہو چکا ہے کہ اب اس پر کلام کی گنجائش نہیں رہ جاتی، لیکن اگر اس کی حجیت کو ہی مشکوک کر دیا جائے تو پھر مزید کلام کی گنجائش نہیں، چونکہ فہم قرآن اور شرح قرآن موقوف ہے حدیث نبوی پر اس لیے اگر اسی کو مشکوک قرار دے دیا جائے تو پھر فتنۂ اہل قرآن کی راہ مسدود کرنے والی کوئی چیز باقی نہیں بچتی، افکار شاذ میں اہل قرآن کا ملغوبہ بھی موجود ہے، یہی کام مستشرقین نے کیا ہے اور اسی کا بیڑا مسلم معاشرہ میں موجود ان کے شاگردوں نے اٹھایا ہے، جو یورپ کے محبوب اور منظور نظر ہیں، ان کے نظریات کو

یورپ Modern Islam اور ایسے افکار و تعامل کو Modern Islam کا نام دیتے ہیں، اور ان پر امت میں ہمیشہ اجماع رہا ہے لیکن یہ مؤلف ایسی خود پسندی میں مبتلا ہے کہ اسے اپنی ذات کے علاوہ چودہ صدیوں میں کوئی عقل کل ہی نظر نہیں آتا اور وہ تمام علماء کو طفل مکتب سمجھتا ہے، خود پسندی کے اسی شیطانی جذبہ نے قرآنی آیات میں تحریف کرنا، بلا دلیل حدیثوں کو جھٹلانا اور شریعت کے مسلم عقائد کو یہود و نصاریٰ کی کارستانی قرار دینا اس کے لئے آسان کر دیا ہے۔

امام مہدی کا انکار کرنے کے لئے اس نے ناحق ختم نبوت کو دلیل بنا کر مہدی کو چھوٹا نبی ہونے کی گالی دی ہے حالانکہ اگر یہ شخص **وانا لہ لحافظون** پر ہی غور کر لیتا تو اس کے قلم سے ایسی حماقتیں نہ نکلتیں، کیونکہ قرآن نے تکمیل دین کے بعد اس کی حفاظت کی جو ذمہ داری لی ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارا دین صرف کتاب و تحریر میں محفوظ رہے گا بلکہ ضمانت میں عملی تحفظ بھی شامل ہے کہ ہزار آزمائشوں کے باوجود امت میں ہر دور میں ایسا گروہ موجود رہے گا جو دین کی مجسم تصویر اور شریعت کا عملی پیکر ہوگا، ورنہ خالی حفاظت سے کیا ہوتا ہے جب تک اسے ایک مشن بنانے والی جماعت موجود نہ ہو، حدیث کے مطابق اسی جماعت کا قائد دین کا مجدد ہوتا ہے جس سے استفادہ کی خدائی نظام کے تحت امت پابند ہے، لیکن اس کی تعیین نہیں کی جاتی، راشد شاذ نے تجدید دین کی حدیث، فتن کی روایات اور مہدی و مسیح کے انکار میں کوئی بھی معقول دلیل نہیں دی اور اس باب میں جن تجزیوں سے کام چلانے کی کوشش کی ہے وہ تاریخ میں ہر اس شخص کا ہتھیار رہے ہیں جو قرآن و حدیث کے دلائل سے بالکل تہی دامن ہو، لیکن اپنے گمراہ موقف کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہو، ہمیں اس باب میں موصوف کی گفتگو میں وہی رنگ نظر آتا ہے جو کبھی استشراقیت، انکار حدیث اور کمیونسٹوں کی تحریروں میں جھلکتا تھا، اہل علم کے نزدیک یہ دلائل نہیں بکواس ہیں جن کا سہارا لیکر مہدویت تو کیا رسالت والوہیت کا بھی با آسانی قصہ پاک کیا جا سکتا ہے۔

اہل باطل دین کے کسی بھی تصور کو جھٹلانے کے لئے آج کل ایک حربہ بہت استعمال کر رہے ہیں اور وہ ہے اسے یہودیت و نصرانیت کا چربہ قرار دینا، وہ پہلے اس تصور کے مجمل خد و خال قدیم مذاہب میں تلاش کرتے ہیں اور پھر اسی کو دلیل بنا کر منصوص و متواتر عقیدے کو موضوع کہہ ڈالتے ہیں اور انھیں ذرا بھی خوف نہیں ہوتا، ماضی قریب میں تمام گمراہوں کا یہی طریقہ رہا اور ایسی ہی مشابہتیں دریافت کر کے ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری نے **فی الادب الجاھلی** نامی بے ہودہ کتاب لکھ ڈالی اور انھیں مفروضوں کے ذریعہ اس نے جاہلی ادب کے تمام ذخیرے کو مشکوک قرار دینے کی ناروا کوشش کی تھی، ڈاکٹر راشد شاذ بھی استشراقیت کے علمبرداروں کی طرح اپنی تحریروں میں جگہ جگہ اسی یہودی ذہنیت کو استعمال کر کے ایسا سینہ پھلاتے ہیں گویا انھوں نے تحقیق کی دنیا میں کوئی دھماکہ کر دیا ہو، حالانکہ یہ نظریہ ہی سرے سے غلط ہے اور اسے درست مان لینے کی صورت میں کوئی بھی طالع آزما مہدی تو کیا عقیدہ کی پوری عمارت کو شہید کر سکتا ہے، کیا یہ منکر مہدی نہیں جانتا کہ دین تو سب کا یکساں ہے اور بس شریعتیں ہی مختلف ہیں تو ایسی مشابہتیں تو ایمانیات سے لیکر عبادت و معاملات تک ہر باب میں نکل آئیں گی تو کیا وہ ردعمل کا شکار ہو کر پورے دین کا انکار کر بیٹھے گا؟ جب مہدی کے ظہور کی صحیح روایات موجود ہیں، جب صحابہ و تابعین بھی اس عقیدے کو مانتے ہیں اور خیر القرون سے دور حاضر تک جب تمام بڑے بڑے علماء اس عقیدے کی توثیق کرتے ہیں تو راشد شاذ جیسے منکر حدیث، استشراقیت کے علمبردار اور مشکوک کردار شخص کی بکواس کو پرکاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں دی جا سکتی اور مسئلہ مہدی ماضی کی طرح آج بھی شکوک و شبہات سے بالاتر ٹھہرتا ہے۔

☆☆☆

نقد ونظر (قسط—۱)

# راشد شاز کے ایام گم گشتہ کا ایک ورق

مولانا الیاس نعمانی ندوی

[شخصیات کی حقیقت کے ادراک میں ان کا ماضی بہت راہ نمائی کرتا ہے، ان کے ماضی کا مطالعہ ان کی مزاجی ونفسیاتی کیفیات کا پتہ دیتا ہے، اور ہمیں بتاتا ہے کہ حال کے پردہ کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما ہیں، زیر نظر تحریر شاز صاحب پر زیر تصنیف ایک مختصر کتاب کے ابتدائی صفحات ہیں، جن میں ان کے ماضی کی روشنی میں یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کی طبیعت میں پائی جانے والی مہم جوئی کے اہداف ومقاصد کیا ہیں؟ امید ہے کہ موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ان صفحات کے مطالعہ سے شاز صاحب کی حقیقت کا ادراک کرسکیں گے۔]

''جب سے خلافت کا ادارہ تباہ ہوا ہے مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں No man's land میں آپڑا ہوں، نہ میرا کوئی ملک ہے نہ شہریت، میں جس نظام کا حصہ تھا اور جس ملک کی شہریت اختیار کررکھی تھی وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا، میرے پیروں تلے سے زمین نکل چکی ہے، میں خود کو ہر لحہ ہوا میں معلق محسوس کرتا ہوں'' (۱)۔

اس اقتباس کو پڑھ کر ہر قاری کو یہی محسوس ہوگا کہ اس کا لکھنے والا غالباً خلافتِ عثمانیہ کے آخری عہد میں کسی ایسے ملک کا شہری رہا ہوگا جو خلافت کے ماتحت ہوگا، اور اس کی حیات میں خلافت عثمانیہ کا سقوط ہوا ہوگا، اس سقوط نے اس کو شدید صدمہ سے دوچار کردیا ہوگا، اس پر وہ خون کے آنسو رویا ہوگا اور اس کے دل ناشاد نے نہ جانے کیسے کیسے فریاد کی ہوگی، صدمہ کی شدت کا یہ عالم رہا ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو No man's land میں پڑا ہوا ایک ایسا شخص محسوس کرتا ہوگا جس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو اور اس کو ہوا میں معلق کردیا گیا ہو۔

لیکن آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یہ اقتباس کسی ایسے شخص کا نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسے شخص کا ہے جو خلافت کے خاتمہ کے بہت بعد میں پیدا ہوا، اس نے خلافت کا زمانہ نہیں پایا، وہ پیدائش سے اب تک سیکولر جمہوری ہندوستان کا شہری رہا، اس پر سقوطِ خلافت کا حادثہ کبھی نہیں گزرا، آپ سوچتے ہوں گے پھر یہ کون ہے جو اس طرح کی سنسنی خیز باتیں لکھتا ہے؟ اور کیوں لکھتا ہے؟

یہ اقتباس راشد شاز کی ایک تحریر سے ماخوذ ہے جو انہوں نے اپنے مجموعۂ مضامین ''ہندوستانی مسلمان، ایام گم گشتہ کے پچاس برس'' کے ابتدائیہ کے طور پر تحریر کی ہے۔ یہ اور اس جیسی متعدد تحریریں شاز صاحب کے اس ماضی کی یادگار ہیں جس میں وہ ہندوستانی مسلمانوں کے 'قائد اعظم' بننے کے لئے کوشاں تھے، اور ملکی سیاست میں زور آزمائی کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن اس کے لئے انہوں نے میدان سیاست کے دوسرے شہ سواروں سے ایک بالکل مختلف راہ عمل اختیار کی تھی، جس کی کچھ تفصیل اگلی سطروں میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

راشد شاز کی زندگی اور ان کا فکری سفر تضادات والتباسات بلکہ تلبیسات (۲) کی ایک عجیب داستاں ہے، راقم کو موصوف کی کسی تحریر کے پڑھنے کا پہلا اتفاق ۱۹۹۹ء یا ۲۰۰۰ء میں ہوا تھا، اس وقت وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے آخری درجات کا طالب علم تھا، اور ندوہ کے کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی میں ان کے چند مضامین کا مجموعہ ''ہندوستانی مسلمان، ایام گم گشتہ کے پچاس برس'' نظر سے گزرا تھا، لیکن اس وقت کے ان کے افکار آج کے ان کے نظریات سے یکسر مختلف تھے۔ تب وہ 'نظام کفر کی طناب لپیٹنے' اور 'ایک ہمہ گیر عالمی خلافت کے قیام' کے متمنی تھے، اور اپنی دانست میں اس کے لئے کوشاں بھی تھے، یا کم از کم دوسروں کو ایسا بتانا چاہتے تھے، تب ان کا نظریہ یہ تھا کہ:

''ایک ہمہ گیر عالمی خلافت کا قیام اور امام عادل کی راہ نمائی میں نظام عدل کا استحکام ہمارا بنیادی دینی فریضہ ہے، شریعت کی رو

سے خلافت کی کرسی تین دن سے زیادہ خالی نہیں چھوڑی جاسکتی، جب تک منہاج النبوۃ پر خلافت کا قیام عملاً ممکن نہیں ہوتا مسلمان کی حیثیت سے ہمارے لئے آرام کا کوئی لمحہ نہیں ہے۔(۳)''

اس عہد میں انہوں نے ایک ملی پارلیامنٹ قائم کی تھی، جنوری ۱۹۹۶ء کو پٹنہ میں منعقد ہونے والے اس کے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں شر کا کو انہوں نے یہ نوید جانفزا بھی سنائی تھی کہ:

''ہم میں سے بہتوں کو شاید اس حقیقت کا احساس نہ ہو لیکن کل کا مؤرخ لکھے گا کہ پٹنہ کی سرزمین پر منعقد ہونے والے ملی پارلیامنٹ کے اس اجلاس سے جو صدا اٹھی تھی اس نے مستحکم نظام کفر کی طناب لپیٹنے کی ابتدا کر دی تھی.....عین اس لمحے تاریخ کروٹ لے رہی ہے، پچاس سالہ سیاسی غلامی کے خلاف علم بلند ہو چکا ہے، اور امت کے مٹھی بھر دردمندوں نے اپنا سب کچھ دے کر اس ملک میں ایک نئی صبح کے قیام کے لئے ہر ناممکن کو ممکن بنانے کا عزم کر لیا ہے۔(۴)

ہم آج تک (جب کہ اس اجلاس کو منعقد ہوئے بیس برس کا عرصہ ہو چکا ہے) یہ جاننے کے متمنی رہے کہ امت مسلمہ ہند یہ کے وہ 'گلہائے سرسبد' کون تھے جنہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر کے ''مستحکم نظام کفر کی طناب لپیٹنے کی ابتدا کر دی تھی'' مادہ پرستی کے اس عہد میں وہ کون سا مقدس گروہ تھا جس نے یہ عظیم الشان قربانی دی تھی، ہمیں ان بندگانِ خدا کی قربانیوں کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی اور ہم یہ بھی نہیں جان سکے کہ نظام کفر کی طناب پر اس قدسی صفات گروہ کی قربانیوں اور کاوشوں کا کس قدر اثر پڑا، خدا جانے 'کل کا مؤرخ' یہ سب کیسے جان سکے گا؟۔

مندرجہ بالا اقتباسات کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنی زندگی اور فکر کے اس مرحلہ میں شاز صاحب نے نظام کفر کو پاش پاش کر کے عالمی خلافت کے قیام کے لئے کوئی منصوبہ اور لائحۂ عمل بنایا ہوگا، جس پر عمل کا آغاز کرتے ہی انہیں محسوس ہوا ہوگا کہ اب 'نظام کفر کی طناب' لپٹنے لگی اور 'صبح نو' طلوع ہوا چاہتی ہے، منہاج النبوۃ پر خلافت کے قیام کے لئے جو لائحہ عمل بھی بنایا گیا ہوگا وہ یقیناً نظام کفر سے الگ اور اس سے برسرپیکار رہا ہوگا، نیز اس نظام کو مکمل طور پر مسترد کرتا ہوگا۔

لیکن ملی پارلیامنٹ کے جس پلیٹ فارم سے یہ سب کچھ کرنے کے بلند بانگ دعوے کیے جا رہے تھے اسی پلیٹ فارم سے ایک سیاسی پارٹی بنا کر ملکی سیاست میں کودنے کے منصوبے بھی بنائے جا رہے تھے، 'ہندوستانی مسلمان، ایام گم گشتہ کے پچاس برس' کے صفحات میں اس سلسلہ کی کاوشوں کی تفصیلات پڑھی جاسکتی ہیں، کیسا مقام حیرت ہے جس نظام کو نظام کفر کہا جا رہا تھا جس کی طناب لپیٹ دینے کی باتیں ہو رہی تھی، جس کو تباہ کر کے ہمہ گیر عالمی خلافت کے قیام اور امام عادل کی راہ نمائی میں نظام عدل کے استحکام کو بنیادی دینی فریضہ اور اپنا اولین ہدف بتایا جا رہا تھا، اسی نظام کفر کے تحت الیکشنی سیاست میں کودنے کی باتیں ہو رہی تھیں، ایک مسلم سیاسی پارٹی بنائی جا رہی تھی، اس کا خود ساختہ قائد بنا جا رہا تھا، اور ایک مکتوب تحریر کر کے لوگوں کو اپنے اس انتخاب کی اطلاع دی جا رہی تھی۔ (اس سلسلہ کی مکمل تفصیلات کے لئے شاز صاحب کے مذکورہ بالا مجموعۂ مضامین کے علاوہ ان کا کتابچہ 'مسلم سیاسی پارٹی' ملاحظہ ہو)۔

اس روش کو آپ ''تلبیس'' کے علاوہ اور کیا نام دیں گے، قیام خلافت کے نعرے لگا کر اور اس کے نام پر لوگوں کو جمع و متوجہ کر کے ہندوستان کے جمہوری نظام کے تحت الیکشن میں حصہ لینے کے لئے مسلم سیاسی پارٹی قائم کی جا رہی ہے، ''قیام خلافت'' کے حسین و دیدہ زیب پردۂ زنگاری کے پیچھے سے کیسا قبیح محبوب سامنے آیا تھا، شاز صاحب کے یہاں تلبیس کی یہ روش ماضی سے حال تک بدستور جاری ہے، ہاں اس کے مظاہر بدل رہے ہیں۔ ماضی کا یہ مطالعہ ان کی شخصیت کے وہ عناصر ترکیبی سامنے لاتا ہے جو سیاسی میدان میں ناکامی کے بعد شاز صاحب کو ایک اور میدان میں سرگرم کیے ہوئے ہیں۔

## حواشی

(۱) ہندوستانی مسلمان ایام گم گشتہ کے پچاس برس مطبوعہ دہلی ۱۹۹۹ء، ص:۶۔(۲) تلبیس ''اصل میں عربی زبان کا لفظ ہے، جس میں انسان حقیقت چھپا کر خلافِ حقیقت ظاہر کرتا ہے، اسی معنی میں اس لفظ کو استعمال کرتے ہوئے امام ابن جوزی نے اپنی مشہور کتاب کا نام ''تلبیس ابلیس'' رکھا ہے۔(۳) ہندوستانی مسلمان ایام گم گشتہ کے پچاس برس مطبوعہ دہلی ۱۹۹۹ء۔(۴) خطبۂ صدارت، مطبوعہ دہلی۔

☆☆☆

نظریہ تعلیم

# نظام تعلیم کی ثنویت اور اسلام

محمد مجاہد ندوی
صدر اسلامک اسٹڈیز ارقم پبلک اسکول، مہاراشٹر
Emil: mmujahidnadwi99@gmail.com

نظام تعلیم کو کسی بھی قوم کی بقا، تحفظ اور ترقی میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ نظام تعلیم نئی نسلوں تک قومی ورثہ کو منتقل کرنے اور انہیں قوم کے عقائد و تصورات، خیالات و نظریات اور تہذیب و ثقافت کا امین اور سچا وارث بنانے کا اہم ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے تعلیمی نظام کو جامع، متوازن اور مؤثر بنانے پر خصوصی توجہ مرکوز کی، مسلمانوں نے جو نظام تعلیم قائم کیا تھا وہ کبھی بھی جمود و تعطل کا شکار نہیں ہوا، اس کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے دین کے اصل مزاج و مقصد کو باقی رکھتے ہوئے زمانہ کے تغیرات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ رکھا، انہوں نے اپنے تعلیمی نصاب میں زمانہ کے مروجہ علوم کو جگہ دی، اور اسے اپنے زمانے کا سب سے زیادہ مؤثر اور زمانہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ (Up to date) تعلیمی نظام و نصاب کے طور پر باقی رکھا۔ مسلمانوں نے اپنے نظام تعلیم کو مؤثر بنانے کے لیے جہاں دیگر تعلیمی امور کو ملحوظ رکھا وہیں انہوں نے اپنی دینی و دنیوی تمام ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ایک ہی نظام تعلیم ترتیب دیا۔ ان کے نظام تعلیم میں صرف دینی علوم شامل نہیں تھے بلکہ وہ تمام جدید علوم اور مہارتیں شامل تھیں جن کی مسلم معاشرے کو ضرورت تھی۔

مسلمانوں نے جو نظام تعلیم قائم کیا تھا اس میں دینی و عصری علوم ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔ مسلمانوں میں دینی مدارس اور غیر دینی مدارس کا کبھی بھی کوئی تصور نہیں رہا۔ انہوں نے جو نظام تعلیم قائم کیا تھا وہ ان کی دین و دنیا دونوں کی ضروریات پوری کرتا تھا، چنانچہ ایک ہی تعلیمی ادارے کے فارغین میں ماہر علماء بھی ہوتے تھے اور دوسرے تمام شعبوں کے ماہرین بھی۔ علماء کرام مسلمانوں کی مساجد میں امامت و خطابت اور دینی مسائل میں ان کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے تھے، جبکہ زندگی کے دوسرے شعبوں کے ماہرین اپنے اپنے شعبوں میں اپنی خدمات انجام دیتے تھے۔ اس طرح سے ایک ہی تعلیمی نظام و نصاب کے ذریعے مسلمانوں کی دینی و دنیوی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔

مشترکہ نظام تعلیم کا یہ سلسلہ برسوں سے مسلمانوں میں رائج رہا، جس کے مثبت اور نفع بخش اثرات مرتب ہوتے رہے، جب تک مسلمانوں میں یہ نظام قائم رہا مسلمان علم و فن کے ہر میدان میں کامیابیاں حاصل کر رہے تھے۔ اور اس نظام تعلیم نے مسلمانوں کے خالص دینی تقاضے بھی پورے کیے اور خالص دنیوی تقاضے بھی۔ ان میں بڑی بڑی ریاستیں بھی قائم ہوئیں، بڑے بڑے شہر اور ملک فتح ہوئے، نئی تہذیب و تمدن کی بنیاد پڑی ان سب کے نظم و نسق کے لئے ماہر افراد بھی اسی نظام تعلیم سے مہیا کیے گئے۔

مشترکہ نظام تعلیم کا ایک اہم فائدہ یہ تھا کہ جو افراد دنیا کے دیگر شعبوں میں اختصاص کرتے تھے اور ان شعبوں میں مہارت پیدا کر کے سول سروسس اور ایڈمنسٹریشن میں اپنی خدمات انجام دیتے تھے، وہ بقدر ضرورت دین کی بنیادی تعلیمات عقائد،

عبادات، معاملات، اخلاقیات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، صحابۂ کرام کے حالات زندگی اور اسلامی تاریخ سے واقف ہوتے تھے۔ اور شریعت کے بنیادی مقاصد اور اس کی روح سے آشنا ہوتے تھے۔اسی طرح جو حضرات دینی علوم میں تخصص کرتے تھے اور مسلمانوں کی مذہبی ضروریات کی تکمیل کا فریضہ انجام دیتے تھے وہ بقدر ضرورت معاصر علوم، جدید اسلوب اور لب ولہجہ سے واقف ہوتے تھے اور اپنے زمانے کے لوگوں کی نفسیات اور مزاج و مذاق کو سمجھتے تھے۔اسی کا نتیجہ تھا کہ علماء کرام اور جدید تعلیم یافتہ افراد میں باہمی ربط وتعلق اور افہام وتفہیم کی فضا قائم تھی۔علماء کرام جدید طبقے کی الجھنوں اور ان کے مسائل کو سمجھتے تھے۔اور جدید اسلوب میں، جدید ضروریات کے پیش نظر اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتے تھے۔اور جدید تعلیم یافتہ حضرات میں خدا کا خوف، فرائض و واجبات کی ادائیگی، دین سے وابستگی اور اس کے تئیں احترام و محبت کے جذبات پائے جاتے تھے۔

برصغیر میں بھی انگریزوں کی آمد سے قبل جو نظام تعلیم رائج تھا اور جسے ''درس نظامی'' سے موسوم کیا جاتا تھا اس میں بھی کسی قسم کی کوئی تقسیم نہیں تھی۔ اس میں جہاں دینی علوم پڑھائے جاتے تھے وہیں عصری علوم بھی اس کے نصاب میں شامل تھے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی فرماتے ہیں:

''ہندوستان میں جو نظام تعلیم کئی صدیوں سے چلا اور جس کو آخری دور میں درس نظامی سے موسوم کیا جانے لگا، اس کو ترکستان وایران میں بھی قبول کیا گیا، اس میں بھی کسی قسم کی تقسیم نہیں تھی، وہ نظام تعلیم یہاں ہر قسم کی ضرورت کے اشخاص پیدا کرنے کا ذمہ دار تھا، یعنی وہ جہاں علماء وفقہاء اور مفتی پیدا کرتا تھا، اور اس وقت کی سلطنت کو قاضی اور ماہرین فقہ مہیا کرتا تھا، وہاں ایڈمنسٹریشن اور سول سروس کے ماہرین بھی تیار کرتا تھا، اس نظام تعلیم کے علاوہ کوئی دوسرا نظام تعلیم اس ملک میں موجود نہیں تھا جو خاص قسم کے اشخاص پیدا کرے، ان تمام تمدنی، تعلیمی، اخلاقی اور اجتماعی ضروریات کے لیے ایک ہی نظام تعلیم پر انحصار تھا۔(۱)

مشترکہ نظام تعلیم کا یہ سلسلہ ہندوستان میں صدیوں جاری رہا، اور اس سے علماء وفقہاء اور دنیاوی شعبوں کے ماہرین بھی پیدا ہوتے رہے، چنانچہ مغلیہ دور میں جس درس گاہ نے، جس نظام تعلیم اور نصاب تعلیم نے مجدد الف ثانی جیسا شخص پیدا کیا، (جس کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا: مسلم ہندوستان نے سب سے بڑا جو مذہبی عبقری پیدا کیا، وہ شیخ احمد سرہندی تھے)، اسی نظام میں نواب سعداللہ خان بھی تیار ہوا تھا جو مجدد صاحب کا کلاس فیلو تھا اور جو سلطنت مغلیہ کا وزیر اعظم بنا۔وہ سلطنت مغلیہ جو موجودہ افغانستان، پاکستان، ہندوستان، نیپال، بنگلہ دیش، سری لنکا، بھوٹان، سکم، برما، ان سب ریاستوں پر مشتمل تھی۔اس کے نظام کو اس نے شاہ جہاں کے زمانے میں کامیابی سے چلایا تھا۔ پھر سید احمد معمار جس نے تاج محل بنایا، یہ بھی مجدد صاحب کا کلاس فیلو تھا۔ یہ تینوں ایک ہی استاذ کے شاگرد تھے اور ایک ہی درس گاہ کے پڑھے ہوئے تھے۔اب دیکھئے کہ ایک وہ شخص جس نے دنیا کی متمدن ترین سلطنت کو اس کے کامیاب ترین ادوار میں اس کو قیادت فراہم کی اور اس کا نظام چلا کر دکھایا، دوسرا وہ شخص جو ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بڑا عبقری ہے، جس کی عظمت کو بیان کرنا دشوار ہے اور جس نے برصغیر کی دینی تحریکات پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ بعد کی کوئی دینی تحریک اور کوئی دینی سرگرمی اس کے اثر اور شخصیت کے احترام سے خالی نہیں ہے، اور تیسرا وہ شخص جس نے دنیا کے سات عجائب میں سے ایک عجوبہ بنایا، یہ تینوں افراد ایک ہی نصاب کے پڑھے ہوئے اور ایک ہی تعلیمی نظام کی پیداوار تھے۔''(۲)

ایک طویل عرصہ تک مسلمانوں میں مشترکہ نظام تعلیم کا یہ سلسلہ قائم رہا۔لیکن افسوس کہ مغلوں کے دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔اور چونکہ اول مرحلہ میں مسلمانوں نے ہی انگریزوں سے مقابلہ کیا اور انہیں شکست دینے اور ہندوستان سے نکالنے کی حتی المقدور کوششیں کی،

لہذا جب انگریزوں کے قدم ہندوستان کی سرزمین میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے تو انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کو کچلنے کا فیصلہ کیا، انہوں مسلمانوں کو دین سے ہٹانے اور ان کی دینی حمیت کو ختم کرنے کے لئے بہت سے اقدامات کیے۔ قرآن پاک کے نسخے جلائے، ہزاروں علماء کو پھانسی دی گئی، بہت سے علماء کرام کو بغاوت کے جرم میں قید کیا گیا اور بے شمار علماء کرام کو جلاوطن کر کے کالا پانی کے جزیرے میں نظر بند کر دیا گیا۔ دوسرا کام انگریزوں نے یہ کیا کہ مسلمانوں کے نظام تعلیم کو ختم کر دیا اور اس کی جگہ ایک بے دین (Secular) نظام تعلیم نافذ کر دیا جس میں مذہبی تعلیم کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اور جس کا مقصد ایسے افراد پیدا کرنا تھا جو رنگ و نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں مگر دل و دماغ اور فکر و سوچ کے اعتبار سے انگلستانی ہوں۔ یہ نظام تعلیم انگریزوں نے ان کے مخصوص نظریات کے مطابق اور اپنی مخصوص ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے قائم کیا تھا۔

جب انگریزوں نے برصغیر میں مسلمانوں کے نظام تعلیم کو ختم کر کے ایک سیکولر نظام تعلیم نافذ کر دیا تو علماء کرام اور مسلمان مفکرین کو شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی زوال ہو چکا ہے اور اب مسلمانوں کے دین و مذہب اور تہذیب و ثقافت کی خیر نہیں ہے، اور یہاں مسلمانوں کے اسلامی تشخص کا باقی رہنا بھی محال ہے، اس خطرے کا سد باب کرنے کے لیے انہوں نے سب سے پہلے تعلیم کی طرف توجہ کی۔ چنانچہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حاجی عابد حسین اور ان کے بعض رفقاء نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی، تاکہ کم سے کم مسلمانوں کے دینی سرمائے کی حفاظت کی جاسکے، اور اسلامی تشخص کو باقی رکھا جاسکے۔ دینی علوم کو زندہ رکھنے اور پڑھنے پڑھانے کا انتظام کیا جاسکے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ فرماتے ہیں:

''انگریزی استعمار کے آنے سے پہلے سارے مسلمانوں کا ایک ہی نظام تعلیم ہوا کرتا تھا، اور درسِ نظامی میں جہاں دین پڑھایا جاتا تھا وہاں دین کے ساتھ عصری علوم بھی پڑھائے جاتے تھے اور ایک خاص سطح تک دین کی بنیادی تعلیمات حاصل کرنے کے بعد تمام علوم میں جو شخص اختصاص پیدا کرنا چاہے اس کے لئے راستے موجود تھے، لیکن دین کی بنیادی معلومات ہر ایک کو حاصل ہو جاتی تھیں، یہ طریقہ تھا جو اسلاف کے وقت سے انگریزوں کے استعمار کے آغاز تک چلا آیا لیکن انگریزوں کے استعمار کے آنے کے بعد چونکہ سرکاری تعلیمی اداروں سے اسلام اور دین کو دیس نکالا دے دیا گیا اور اس میں اسلام کی تعلیم کا کوئی قابلِ ذکر حصہ موجود نہیں تھا، اس لئے علماء کرام مجبور ہوئے کہ وہ دارالعلوم دیوبند قائم کر کے کم از کم اسلامی علوم کو ہی سمیٹ کر بیٹھ جائیں، ان پر معاش کے دروازے بند کئے گئے، انہوں نے قربانیاں دیں، انہوں نے فقر و فاقہ برداشت کیا، موٹا جھوٹا پہن کر، روکھی سوکھی کھا کر دین اور اس کے علوم کو محفوظ کیا، کہ جب کبھی ضرورت پیش آئے تو ان علوم سے فائدہ اٹھایا جاسکے''۔ (۳)

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے ساتھ جو کہ دینی علوم کا نمائندہ تھا، بعض مسلمان مفکرین کو خیال آیا کہ مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کا بھی انتظام کیا جانا چاہیے تاکہ مسلمان انگریزی زبان اور جدید علوم و فنون بھی پڑھیں اور زمانہ سے پیچھے نہ رہیں، اس کے لیے مرحوم سر سید احمد خان کی رہنمائی میں علی گڑھ میں ایک مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح مسلمانوں میں تعلیم کی دو قسمیں ہوگئیں اور ان کے تعلیمی نظام نے دو متوازی رخ اختیار کر لیے، ایک طرف علماء کرام نے دارالعلوم دیوبند کے طرز پر سارے ملک میں مدارس کا جال بچھا دیا، اور اپنی تمام تر توجہ دینی علوم کی تعلیم پر مرکوز کر دی۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کا ایک دوسرا طبقہ جدید تعلیم کی طرف متوجہ ہوا اور انہوں نے اپنا ماڈل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بنالیا، اس طرح سے بے شمار مسلم اسکولوں اور کالجوں کا قیام عمل میں آیا۔

مذکورہ بالا صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے نظام تعلیم میں وحدت نہ رہی اور اسلامی تاریخ میں پہلی بار دینی اور عصری

تعلیم کے درمیان دوئی پیدا ہوگئی، دینی مدارس اور عصری مدارس جدا ہوگئے، اور دونوں نظام تعلیم نے متوازی رخ اختیار کرلیا۔

## نظام تعلیم کی ثنویت کے نقصانات

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے جو دو تعلیمی ادارے قائم کیے ان دونوں اداروں نے ان حالات میں ان کی دینی و دنیوی دونوں ضرورتوں کو پورا کیا۔ دارالعلوم دیوبند نے مسلمانوں کی دینی ضروریات کو پورا کیا، اس نے مسجدوں کو امام وخطیب مہیا کیے، مسلمانوں کے لیے دینی تعلیم کا انتظام کیا، ان علماء کرام پر معاش کے دروازے بند کیے گئے، انہیں دنیوی وسائل سے محروم ہونا پڑا، انہوں نے اس راہ میں بے شمار قربانیاں پیش کیں، اور موٹا جھوٹا پہن کر، روکھی سوکھی کھا کر دینی علوم کو محفوظ کیا اور مسلمانوں کے اسلامی تشخص کو باقی رکھنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ اور علی گڑھ نے مسلمانوں کی دنیوی ضرورتوں کو پورا کرنا شروع کردیا، اور خاص طور سے سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر کھولدیے۔ ان وجوہ کی بنا پر دیوبند اور علی گڑھ ہی مسلمانوں کے لیے نمونہ بن گئے اور نظام تعلیم کی ثنویت کو مسلمانوں نے قبول کرلیا۔ لیکن چونکہ نظام تعلیم کی اس ثنویت کو چند ناگزیر اسباب اور ہنگامی حالات کے پیش نظر قبول کرلیا گیا تھا۔ ورنہ یہ کوئی مثالی نظام تعلیم نہیں تھا کہ اس کو زیادہ عرصہ تک باقی رکھا جاتا۔ لہذا جہاں اس کے بہت سے مثبت اثرات رونما ہوئے وہاں مسلم معاشرے میں اس ثنویت کے بہت سے منفی اثرات بھی مرتب ہوئے۔

دینی و دنیوی علوم کی تفریق کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ ایک طرف عصری اداروں کے تربیت یافتہ افراد کا حال یہ ہوگیا کہ وہ ایک ماہر ڈاکٹر، انجینئر یا دیگر عصری علوم کے ماہر تو ہو جاتے ہیں لیکن اسلام کی بنیادی تعلیمات سے بھی ناواقف رہتے ہیں۔ اسلام میں کیا حرام ہے؟ کیا حلال ہے؟ کیسی زندگی انسان کو کامیاب کرتی ہے؟ اور مسلمان کی حیثیت سے زندگی گزارنے کے کم سے کم تقاضے کیا ہیں؟ وغیرہ۔ ان تمام باتوں سے اس طبقہ کے اکثر و بیشتر افراد ناواقف ہی رہتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ عصری اسکولوں اور کالجوں میں انگریزوں کا بنایا ہوا نظام تعلیم رائج ہے، جو مغربی فکر و فلسفہ اور مغرب کی خدا بیزار اور مادی ذہنیت پر مبنی ہے۔ لہذا اس نظام تعلیم میں پروان چڑھ کر ایک مسلمان بچہ غیر شعوری طور پر مغرب کے افکار اور اس کے طرز زندگی سے مرعوب ہونے لگتا ہے اور مغربی تہذیب وثقافت کی نقالی شروع کردیتا ہے۔ جبکہ اسلام کی تعلیمات کو دقیانوس اور فرسودہ اور انہیں دنیوی ترقی میں رکاوٹ سمجھنے لگتا ہے۔ دوسری طرف دینی مدارس کے فارغ التحصیل حضرات جنہوں نے مدرسہ کے ایک خاص ماحول میں محض دینی علوم کو حاصل کیا ہوتا ہے، ان کا حال یہ ہے کہ وہ عصری علوم اور زمانہ کے اسلوب سے ناواقف ہوتے ہیں، دنیا کیا سوچتی ہے؟ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی نفسیات کیا ہیں؟ عصر حاضر کے تقاضے اور چیلنجز کیا ہیں اور ان سے کیسے عہدہ برآں ہوا جاسکتا ہے؟ وغیرہ۔ مدارس کے تربیت یافتہ حضرات کی ایک بڑی تعداد ان چیزوں سے ناواقف ہی رہتی ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کرام اور جدید تعلیم یافتہ افراد کے درمیان وسیع خلیج قائم ہوگئی، فریقین میں افہام وتفہیم کی فضا ختم ہوگئی اور ذہنی وفکری بعد پیدا ہوگیا ہے۔ علماء کرام نہ تو جدید تعلیم یافتہ افراد کی الجھنوں اور نفسیات کو سمجھتے ہیں اور نہ زمانہ کے اصل مسائل کو سمجھنے اور جدید اسلوب میں جدید ضروریات کے مطابق اس کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ جس ذہنی فضا اور ماحول میں رہ کر مسجد کے منبر پر بیٹھ کر گفتگو کرتے ہیں، ان کے سامعین کی ذہنی فضا مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح جدید تعلیم یافتہ افراد علماء کرام اور علم دین سے بیزار نظر آتے ہیں، وہ علماء کرام سے ربط وتعلق، ان سے اخذ واستفادہ اور دینی امور میں ان سے مشاورت کو ضروری

نہیں سمجھتے۔اس امر نے تعلیمی ثنویت اور دین و دنیا کی تفریق کی جڑوں کو مسلم معاشرے میں مزید گہرا کر دیا ہے۔

نظام تعلیم کی ثنویت کا ایک بہت بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ ایک متوازن اور معتدل اسلامی شخصیت کا وجود ناپید ہے، ایک مسلم بچہ کو اس کے گھر میں جو ماحول ملتا ہے اور جو چیزیں سکھائی جاتی ہیں اسکول اور کالجوں میں اسے اس کے برعکس تعلیم دی جاتی ہے۔اسکولوں اور کالجوں کا نظام تعلیم اور وہاں کا ماحول جس طرح کے افکار و خیالات کی آبیاری اس کے دل و دماغ میں کرتا ہے وہ ان عقائد اور تصورات سے کھلے طور پر متصادم ہوتے ہیں جو اسلامی معاشرہ کی بنیاد ہیں۔وہ اس نظام تعلیم کی وجہ سے بہت سے ایسے تصورات کو ایک منطقی اور بدیہی نتیجے کے طور پر قبول کر لیتا ہے جو شریعت کی نگاہ میں سرے سے ناقابل قبول ہیں۔اسی طرح سے بہت سی ایسی چیزیں جو اسلامی شریعت کی رو سے ناگزیر ہیں وہ اس نظام تعلیم کے نظریات اور تصورات کی نظر میں مشکوک اور ناقابل قبول ہوتی ہیں۔لہذا جب ایک مسلم نوجوان اس کی آغوش سے تربیت پا کر نکلتا ہے تو قوم کے خیالات اور جذبات سے اس کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے جس سے ایک فکری انتشار اس کے ذہن میں برپا ہو جاتا ہے۔وہ خیال کرنے لگتا ہے کہ دنیا کسی اور چیز کا نام ہے اور دین کسی اور چیز کا، اور دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔اب اگر مذہبی جذبات اس پر غالب آجاتے ہیں اور وہ نوجوان مذہبی زندگی کو اختیار کر لیتا ہے تو پھر دنیا کی چیزوں کو غیر اہم سمجھنے لگتا ہے اور اس کے امور کی انجام دہی کو دنیاداری سمجھ کر اس سے لاتعلق ہو جانا چاہتا ہے۔اور اگر اس پر دنیاداری کا غلبہ ہو جاتا ہے تو وہ دین سے آزاد ہو جاتا ہے، اس کی تعلیمات کو اپنی ترقی میں رکاوٹ سمجھتا ہے اور فرائض و واجبات اور ممنوعات و محرمات کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔

اس صورت حال نے مسلم معاشرے میں فکری انتشار، ذہنی کشمکش اور انتہاء پسندی کو جنم دیا ہے جس کی بنا پر ایک اسلامی شخصیت منتشر ہو کر رہ گئی ہے، اسلامی تشخص مجروح ہو گیا ہے اور ایسے کامل اور متوازن افراد پیدا نہیں ہو رہے ہیں جنہیں دین کی بھی خبر ہو اور دنیا کی بھی، جو خالق کے حقوق کو بھی جانتے ہوں اور مخلوق کے بھی اور جو دنیوی امور کو دین کی روشنی میں اور اپنے خالق کی منشا کے مطابق انجام دیتے ہوں۔

**ایک متحدہ نظام تعلیم کے قیام کی ضرورت:** نظام تعلیم کی ثنویت کے جو منفی اثرات مسلم معاشرے پر مرتب ہو رہے ہیں اور اس کے نتیجہ میں مسلم معاشرہ جس ناگفتہ بہ صورت حال سے دوچار ہے، اس کی محض چند جھلکیوں کو ہی پیش کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے ورنہ اس کا نقصان اس سے کہیں بڑھ کر ہے اور یہ سلسلہ مزید وسیع ہوتا جا رہا ہے۔اس کشمکش کو دور کرنے اور اس ناگفتہ بہ صورت حال کو تبدیل کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے موجودہ نظام تعلیم کی ثنویت کو ختم کر کے ایک ''مشترکہ نظام تعلیم'' قائم کر دیا جائے۔

نظام تعلیم کو متحد کرنے اور اس میں موجود دین و دنیا کی تفریق کو ختم کر دینے کی ہماری یہ آواز نئی نہیں ہے بلکہ اکابر علماء کرام، اور دیگر ماہرین تعلیم کو بھی نظام تعلیم کی ثنویت اور مسلم معاشرے پر اس کے منفی اثرات کا احساس تھا۔چنانچہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی اور ان کے علاوہ دیگر علماء کرام اور مسلمان مفکرین موجودہ نظام تعلیم کی تبدیلی کی آوازیں بلند کر چکے ہیں۔اور اس کے لیے حتی المقدور سعی بھی فرما چکے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی تو اس کے نصاب تعلیم میں دینی علوم کے

ساتھ جدید علوم کو بھی شامل کیا گیا، جو دارالعلوم کے بانیوں کی وسعت نظری، گہری بصیرت اور زمانہ کے حالات اور اس کے تقاضوں سے براہ راست واقفیت کی دلیل ہے۔ان حضرات نے دینی علوم کو اصل اصول اور مینارۂ نور قرار دیتے ہوئے اس کے نصاب میں ان علوم کو بھی شامل کیا جو ذہن کی جلاء اور وقت کے تقاضوں کی تفہیم کے لیے ضروری ہیں۔اور اس کا مقصد خود حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ کے الفاظ میں یہ ہے کہ علوم دینیہ کی تکمیل کے علاوہ ہماری غرض اعظم یہ ہے کہ طلبہ میں اعلی درجہ کی ذہنی قوت واستعداد پیدا ہو اور ان کا دائرہ فکر وعمل بہت وسیع ہوجائے۔ دارالعلوم دیوبند میں دینی علوم کے ساتھ عقلی علوم کے امتزاج کا یہ سلسلہ تقریباً پچاس سال تک جاری رہا بلکہ ہر دور میں اس میں مفید اضافے بھی ہوتے رہے، لیکن افسوس کہ بعض ناگفتہ بہ حالات کے پیش نظر رفتہ رفتہ یہ روایت ختم ہوگئی اور دارالعلوم میں محض دینی علوم کی تدریس پر اکتفاء کرلیا گیا۔ تفصیلی معلومات کے لیے دارالعلوم دیوبند کی روداد اور ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنؤ کے جولائی ۲۰۰۷ کے شمارے میں مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کے شائع شدہ مضمون کا مطالعہ مفید ہوگا۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ دینی و عصری دونوں علوم کی یکساں اہمیت وافادیت کے قائل تھے لہذا آپ دینی علوم کے طلبہ کو عصری علوم کے حصول کی ترغیب دیا کرتے تھے اور اسی طرح وہ چاہتے تھے کہ عصری علوم کے طلبہ دینی علوم حاصل کریں۔ اس کے لیے آپ نے علی گڑھ والوں سے مل کر باقاعدہ یہ معاہدہ کیا کہ دیوبند سے فارغ ہونے والے علی گڑھ جاکر جدید علوم حاصل کیا کریں گے اور اسی طرح علی گڑھ کے فارغ التحصیل دیوبند آیا کریں گے۔(۴)

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' کے حصہ دوم میں لکھتے ہیں:

اس وقت جن تجویزوں کو اپنے دماغ میں رکھتا ہوں اور تفصیلی ذکر جن کا اپنی کتاب ''مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' (حصہ اوّل) میں، میں نے کیا ہے ان کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کے جو دو مستقل نظام (حکومت مسلطہ) کے قیام کے بعد جاری ہوگئے ہیں ان کی دوئی وثنویت کو مٹا کر صرف ایک ہی نظام کو قبول کرلیا جائے۔ اسی لئے اپنی تعلیمی تجویز کا نام میں نے ''نظریۂ وحدت تعلیم'' رکھا ہے۔(۵)

مولانا عتیق الرحمان عثمانی رقمطراز ہیں:

''گزشتہ تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں کا نصاب تعلیم ایک ہی رہا ہے جو علوم دینیہ ودنیویہ دونوں پر مشتمل ہوتا تھا، علوم دینیہ سے مراد تفسیر وحدیث اور فقہ اور ان کے لوازم ومبادی ہیں اور علوم دنیویہ سے مراد وہ علوم ہیں جن کا ہر زمانہ میں چرچا اور رواج رہا ہے اور جن کا پڑھنا پڑھانا، تہذیبی وتمدنی، اقتصادی اور سیاسی مسائل میں فکری یا عملی طور پر ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔ اگر مسلمان اپنی گزشتہ تعلیم کے اس خاکہ کو پیش نظر رکھیں اور پھر اس کی روشنی میں مستقبل کے لیے کوئی نظام تعلیم مرتب کریں تو ان کی بہت سی مشکلات اور بہت سے وساوس وشبہات خود بخود رفع ہوجاتے ہیں۔(۶)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی فرماتے ہیں:

''دو متوازی نظام تعلیم کا کسی ملک یا معاشرہ میں نافذ ہونا، اس معاشرہ کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے، اور یہ اس کو بہت غیر ضروری مشکلات میں مبتلا کردینے کے لیے کافی ہے، اس مسئلہ پر ہندوستان کے اہل فکر نے، اور ہندوستان کے باہر مشرق وسطیٰ کے مفکرین نے اظہارِ خیال کیا ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے ہندوستان میں سب سے پہلے مولانا مناظر احسن گیلانی نے اس مسئلہ پر اظہارِ خیال فرمایا، ۱۹۵۱ء میں جب مجھے مصر جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں کے ایک

عرب فاضل اور بڑے تجربہ کار معلم ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ نے پہلی مجلس اور پہلی ملاقات میں اس پر گفتگو کی، حقیقتاً یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر بہت اطمینان کے ساتھ تبادلۂ خیال ہونا چاہیے۔(۷)

آگے چل کر فرماتے ہیں:

''یہ ذہنی انتشار اور جو کشمکش آپ کو معاشرہ میں نظر آتی ہے، جس کے مظاہر ہم کو زندگی کے مختلف شعبوں میں نظر آتے ہیں، یہ اس دوئی اور اسی دو متوازی نظام تعلیم کا نتیجہ ہے۔''(۸)

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ فرماتے ہیں:

''پاکستان بننے کے بعد سردار عبدالرب نشتر صاحب مرحوم نے ایک تعلیمی ادارے کے قیام کا تصور پیش کیا تھا، اس کے لئے ایک ابتدائی اجلاس بلایا تھا، اس میں حضرت والدِ ماجد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بات ارشاد فرمائی تھی اور وہ یہ کہ پاکستان بننے سے پہلے ہندوستان میں تین قسم کی درسگاہیں تھیں، ایک کی نمائندگی دارالعلوم دیوبند کرتا تھا جس سے علماء کرام پیدا ہو رہے تھے، ایک کی نمائندگی علی گڑھ کرتا تھا، جس سے جدید تعلیم یافتہ افراد پیدا ہو رہے تھے اور ایک کی نمائندگی دارالعلوم ندوۃ العلماء کرتا تھا جس سے ادب، شاعری اور تاریخ کے جاننے والے زیادہ پیدا ہوتے تھے۔ یہ تین مختلف طریقے تھے جو انگریز کے زمانے میں ہمارے ہاں چلے آرہے۔

لیکن میرے والد ماجد نے اس اجتماع میں یہ فرمایا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد ایک اسلامی ریاست کے لئے ہمیں نہ خالص دیوبند کی ضرورت ہے، نہ خالص ندوہ کی، نہ خالص علی گڑھ کی۔ بلکہ ہمیں ایک ایسے متحد نظام کی ضرورت ہے جس میں ہر چیز اپنے مقام پر موجود ہو''۔

آگے چل کر وہ فرماتے ہیں:

''تو حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پاکستان کو ایک ایسے نظام تعلیم کی ضرورت ہے جس میں پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک تمام علوم ایک ساتھ پڑھائے جائیں اور دین کی اتنی معلومات میٹرک تک پہنچادی جائیں جس سے ایک مسلمان کو کم از کم یہ پتہ چل جائے کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے، کس طرح کی زندگی اس کو جنت میں لے جائے گی اور کس طرح کی زندگی اس کو دوزخ میں لے جائے گی۔ یہ بنیادی معلومات اسے کم از کم حاصل ہو جائیں۔ اس کے بعد پھر شاخیں ہوں، کوئی انجینئرنگ کی طرف جارہا ہے، کوئی میڈیکل سائنس یا کامرس کی طرف جارہا ہے، کوئی اسلامی علوم کی طرف جارہا ہے اور اس میں اختصاص اور مہارت پیدا کر رہا ہے یہی نظام ہونا چاہئے تھا لیکن افسوس ہے کہ پاکستان بننے کے بعد بھی ہم اسی غلامی کے طریقہ کار پر چلتے چلے آئے اور ہم نے اسے بدلنے کی کوشش نہ کی، نتیجہ یہ ہے کہ اس سرکاری تعلیم کے نظام سے وہ لوگ تیار ہوتے ہیں کہ اگر انہیں کسی مجلس میں سورہ اخلاص سنانی پڑجائے تو وہ بھی ٹھیک سے نہیں سنا سکتے۔ اس لئے علماء کرام مجبور ہوئے کہ اپنے مدارس کو پھر سے سنبھال کر بیٹھیں اور کم از کم اسلامی علوم کا تحفظ کریں''۔(۹)

مذکورہ بالا اقتباسات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اکابر علماء کرام اور اہل فکر و دانش کو بھی اس امر کا بخوبی احساس تھا کہ مسلمانوں کے نظام تعلیم کے موجودہ ڈھانچے اور اس کی ثنویت نے امت میں بہت سے مسائل کو جنم دیا ہے، اور وہ حضرات اس بات کے خواہاں رہے کہ جلد از جلد اس ثنویت کو ختم کر کے ایک ''مشترکہ نظام تعلیم'' قائم کر دیا جائے۔

درحقیقت جس امر کی ضرورت ہے وہ یہ کہ قدیم اور جدید نظام تعلیم کی وجہ سے جو ثنویت ہمارے یہاں رائج ہوگئی ہے اس کو ختم کر دیا جائے اور ان دونوں تعلیمی نظاموں کے مقابلہ میں ایک تیسرا نظام تعلیم قائم کیا جائے جس میں قدیم اور جدید دونوں نظام تعلیم کی خوبیاں موجود ہوں۔ جہاں دینی علوم اور عصری علوم کی تعلیم یکساں

طور پر دی جائے، تمام عصری علوم اور مہارات کو اسلامی تناظر میں پیش کیا جائے۔ تاکہ ہماری دینی ضروریات بھی پوری ہو جائیں اور عصری ضروریات بھی، یہی نظام تعلیم مسلمانوں کے لیے امام، مفتی اور علماء دین پیدا کرے، اور حکومت و ریاست کا نظم و نسق چلانے کے لیے ماہر افراد بھی یہیں مہیا کرائے جائیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہر فرد کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ دینی علوم کا پورا عالم ہو اور نہ ہی ہر عالم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ انجینئر یا ڈاکٹر بھی ہو۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کو اتنا علم حاصل ہو جائے جسے شریعت کی اصطلاح میں فرضِ عین کہا جاتا ہے، اسے معلوم ہو کہ اسلام کے بنیادی احکام کیا ہیں؟ حلال و حرام میں کیا فرق ہے؟۔ اسی طرح جو لوگ دینی علوم میں اختصاص کی طرف جا رہے ہیں وہ جدید علوم کا تعارفی مطالعہ کر چکے ہوں، جدید لب و لہجہ اور جدید اسلوب میں اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے کا فن جانتے ہوں اور لوگوں کے مزاج و مذاق سے بخوبی واقف ہو۔

اگر یہ نظام قائم ہو جاتا ہے تو اس کے دوررس اثرات مرتب ہوں گے اور مسلم معاشرہ میں ایک انقلابی تبدیلی رونما ہوگی، اس نظام تعلیم سے فارغ التحصیل علماء کرام میں وہ اعلیٰ صلاحیت اور استعداد ہوگی جو جدید تعلیم یافتہ افراد کو ان کی زبان اور اسلوب میں بتا سکیں گے کہ زندگی کے اصل مسائل کیا ہیں؟ اور اسلام نے ان کے حل کے لیے کیا رہنما اصول پیش کیے ہیں؟ وہ بڑی سے بڑی یونیورسٹی کے قانون کے پروفیسر اور ماہرین معاشیات کو ان کی زبان اور اسلوب میں بتا سکیں گے کہ اسلام کا قانونی اور معاشی نظام موجودہ کسی بھی نظام سے بہتر اور قابل عمل ہے۔ نیز ہمارے اس دور میں اس کے نفاذ کی عملی شکلیں کیا ہے؟۔ اسی طرح ایسے ڈاکٹر، انجینئر اور دیگر عصری شعبوں کے ماہرین پیدا ہوں گے جو ایک طرف اپنے شعبوں میں فنی مہارت رکھنے کے ساتھ بنیادی اسلامی تعلیمات، مقاصد شریعت اور دینی مزاج و مذاق سے باخبر ہوں گے۔ اور کائنات پر غور و فکر اور تحقیق و ریسرچ کو قرآنی آیات کے ساتھ جوڑ کر کائنات کی روحانی تعبیر کریں گے۔ علماء اور جدید تعلیم یافتہ افراد میں ربط و تعلق مضبوط ہوگا، دونوں کے مابین افہام و تفہیم کی فضا قائم ہوگی، دینوی شعبوں کے ماہرین ہر معاملے میں علماء کرام سے دینی رہنمائی حاصل کریں گے، اس طرح سے انسانی زندگی کے ہر شعبے میں دین داخل ہو جائیگا اور دنیا کو دین کی روشنی میں برتا جائیگا۔ اس کے نتیجہ میں ایک معتدل اور متوازن اسلامی شخصیت کا ظہور ہوگا، ایک ایسی اسلامی شخصیت جو دین و دنیا کے حسین امتزاج کا دلکش نمونہ، خلافت ارضی کے منصب کی حامل اور اس اعلیٰ منصب کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے احساس اور استعداد سے آراستہ ہو۔

## حواشی

۱۔ نظام تعلیم: مغربی رجحانات اور اس میں تبدیلی کی ضرورت از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، صفحہ: ۶۹۔

۲۔ ماہنامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ، شمارہ مارچ ۲۰۰۵ء: صفحہ ۱۴۔ خطاب از ڈاکٹر محمود احمد غازی۔

۳۔ ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی شمارہ شعبان ۱۴۳۶ھ۔ خطاب از مولانا مفتی محمد تقی عثمانی بموقع سالانہ تقریب جامعۃ الرشید کراچی۔

۴۔ موج کوثر از شیخ محمد اکرم: صفحہ ۲۰۳۔ بحوالہ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل از ڈاکٹر محمد امین: صفحہ ۱۳۳۔

۵۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت (جلد دوم)، صفحہ: ۵۔

۶۔ مقدمۂ کتاب؛ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت۔

۷۔ نظام تعلیم: مغربی رجحانات اور اس میں تبدیلی کی ضرورت از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، صفحہ: ۶۹۔ ۸۔ ایضاً۔

۹۔ خطاب از مولانا مفتی محمد تقی عثمانی بموقع سالانہ تقریب جامعۃ الرشید کراچی۔ مفتی صاحب کا مکمل خطاب یوٹیوب پر حسب ذیل لنک پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

(https://www.youtube.com/watch?v=dhhU)

☆☆☆

شخصیات و سوانح

# مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کی تاریخی خدمات

محمد خالد ضیاء صدیقی ندوی
(جامعہ فیضان القرآن احمد آباد، گجرات)

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''یادرفتگاں'' میں انیسوی صدی عیسوی کے بارے میں لکھا ہے:

''انیسوی صدی کا مطلع خورشید اسلام کا مغرب ہے، فضل وکمال کے کتنے آفتاب وماہتاب تھے جو اس تاریکی میں نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، لیکن صدی کا نصف شب ۱۸۵۷ء تھا کہ مطلعِ سحر سے چند نئے ستارے نمودار ہوئے''(۱)

میرا خیال ہے کہ حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ ان ستاروں کے جھرمٹ میں ''خورشید جہاں تاب'' کی حیثیت رکھتے تھے، کیوں کہ آپ کا تعلق ایسے گھرانے سے تھا جو صدیوں سے علم وعمل، دعوت وعزیمت، اتباعِ سنت اور جانبازی وجاں فروشی کے نمونے پیش کرتا رہا ہے۔ اور جس کا دامن ہر دور میں بزرگان دین، صاحبانِ ارشاد وتلقین، پاسبانِ لوح وقلم اور سپارگان علم وفضل سے لبریز رہا ہے، جناب پروفیسر خلیق احمد نظامیؒ نے بالکل سچ لکھا ہے کہ:

''دعوت وعزیمت، ارشاد وتلقین، علم وفضل، سلوک وعرفان، سخنوری اور سخن شناسی کا شاید ہی کسی خاندان میں وہ اجتماع پیدا ہوا ہو جو رائے بریلی کے دائرہ شاہ علم اللہ میں بسنے والے کو قسام ازل نے ارزانی فرمایا، اور جو آج تک اس خاندان کا طرہ امتیاز ہے''.....آگے مزید لکھتے ہیں کہ:

''اتباع سنت میں کوشش کی تو ''علم اللہ'' بن گئے، عزیمت وسرفروشی نے پکارا تو ''سید احمد شہید'' کی شکل میں

'بنا کردند خوش رسمے بخون وخاک غلطیدن'

کی تصویر پیش کردی، ہندوستان میں اسلامی علوم اور تمدن کے نقوش کے تحفظ کی ضرورت پیش آئی تو "نزهة الخواطر اور "الثقافة الاسلامية في الهند" لکھ کر آنے والی نسلوں کے لئے حکیم سید عبدالحیؒ نے روشنی کے مینار کھڑے کردیئے، علم کا پودا خونِ جگر کی آبیاری کے بغیر برگ وبار نہیں لاتا، دائرۂ علم اللہ میں علم وفضل کی روایت کی آبیاری تین سو سال تک کی گئی ہے، جب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' نے فکر کا پیکر اختیار کیا ہے، علم وارشاد کی اتنی طویل روایت ہندوستان کے بہت ہی کم خاندانوں کو نصیب ہوئی ہے''(۲)

اس روشن دلیل سے ہمارے دعوے کی حقیقت آپ کے سامنے واشگاف ہوگئی ہوگی، ساتھ ہی حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخی خدمات کی ہلکی سی تصویر بھی آپ کی نگاہوں کے سامنے پھر گئی ہوگی، لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی ذرا تفصیل آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

قدرت کے فیاض ہاتھوں سے حکیم صاحب کو جہاں بلا کی ذہانت، ذکاوت وفراست، دوراندیشی ومعاملہ فہمی اور وسیع علم ملا

تھا، وہیں آپ خزانۂ قدرت سے گفتگو کا نرالا انداز، قلم کی شگفتگی، خیالات کی پاکیزگی ورعنائی، زبان کا بانکپن اور رسیلا پن اور تاریخی و ادبی ذوق لے کر آئے تھے۔ یوں تو علوم وفنون کے مختلف چشموں سے آپ نے اپنی تشنگی بجھائی تھی، لیکن تاریخ سے آپ کو گہرا لگاؤ تھا، اور ''تاریخ ہند'' سے تو عشق کی حد تک لگاؤ تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ کے مؤرخانہ قلم سے ہندوستانی علوم وفنون اور سیر وتراجم پر ایسی محققانہ اور نادر کتابیں نکلیں جن سے تاریخ کے کتب خانے میں گرانقدر اضافہ ہوا، آپ نے ان کتابوں کی تصنیف و تالیف میں عمر عزیز کا ایک قیمتی حصہ صرف کیا ہے اور اس راہ میں جو مشقتیں اور صعوبتیں برداشت کی ہیں ان سے متقدمین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، آپ ایک جگہ خود لکھتے ہیں:

''ندوۃ العلماء کے کاموں سے جب فرصت ملتی تو تصنیف وتالیف میں لگ جاتا، دن کے اجالے اور راتوں کی تاریکی میں جو کام بن پڑتا، وہ ان ہی دو چیزوں میں محدود تھا، ''جنۃ المشرق'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں ہندوستان کا جغرافیہ، ظہور اسلام سے لے کر غدر ۱۸۵۷ء تک کی اسلامی تاریخ، مسلمانوں کا طریقۂ حکمرانی اور امور نافعہ کا بقدر امکان تلاش و تحقیق سے ذکر کیا، دوسری کتاب ''المعارف کے نام سے لکھی جس میں علوم وفنون کی تاریخ اور ہندوستان میں جس علم کی جیسی مسلمانوں نے خدمت کی ہے اور جو کتابیں ان علوم میں یہاں تصنیف ہوئی ہیں ان کی تفصیل دی ہے، "نزهة الخواطر" ۸ر جلدوں میں تصنیف کی جن میں ہندوستان کے علماء اور دوسرے ناموروں کے حالاتِ زندگی جنہوں نے علم کی خدمتیں کی ہیں، بڑی کاوشوں اور کاہنوں سے فراہم کیے ہیں'' (۳)

اب ہم ذیل میں حکیم صاحب کی چند تاریخی کتابوں کا مختصر تعارف اور ان کی خصوصیات بالترتیب مستند اور معتبر اہل قلم کے حوالے سے آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

### ۱۔ نزهة الخواطر:

اس کتاب کے متعلق استاذ محترم مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی مدظلہ العالی تحریر فرماتے ہیں: ''یہ کتاب مولانا عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ کا ایک کارنامہ ہے، ہندوستانی مسلمان بجاطور پر اس پر فخر کر سکتے ہیں، یہ کتاب کسی ملک کی تمام صدیوں پر محیط شخصیات پر پہلی کتاب ہے، اس وقت تک کسی ملک میں ایسی کتاب موجود نہیں تھی'' (۴)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن حسنی ندویؒ اس عظیم کتاب کا تعارف یوں کراتے ہیں:

''یہ کتاب آٹھ ضخیم جلدوں میں تیار ہوئی، باریک عربی ٹائپ میں تقریبا تین ہزار صفحات میں آئی ہے، اس میں ساڑھے چار ہزار سے زائد شخصیتوں کے تراجم ہیں، اس کی تصنیف میں مصنف نے جن مآخذ سے فائدہ اٹھایا ہے ان کی تعداد تین سو کتابوں سے کم نہیں، وہ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ہیں، کتاب کی پہلی جلد میں ان اسلامی شخصیتوں سے لے کر جو قرن اول میں ہندوستان آئیں، ساتویں صدی ہجری تک کے مشاہیر کے حالات ہیں، دوسری جلد تنہا آٹھویں صدی کے مشاہیر کے تراجم پر مشتمل ہے، اسی طرح سے ہر جلد میں ایک ایک صدی کے مشاہیر کے تراجم ہیں، یہاں تک کہ ساتویں جلد تیرہویں صدی کے مشاہیر اور آٹھویں (آخری) جلد چودھویں صدی کے مشاہیر کے ساتھ مخصوص ہے''۔(۵)

### کتاب کی چند خصوصیات:

**وسعت وجامعیت:** ''نزہۃ الخواطر'' اس لحاظ سے اس وقت تک سب سے بڑا جامع اور وسیع تذکرہ ہے جو ہندوستان کے مصنف کے قلم سے نکلا ہے، اولاً وہ کسی خاص طبقہ اور صنف کے ساتھ مخصوص نہیں، اس میں علماء ومشائخ، سلاطین وامراء، شعراء وادباء اور ہر صنف وفن کے اہلِ کمال

دوش بدوش اور پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں، ثانیاً اس کا تعلق کسی خاص تاریخی عہد اور صدی سے نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کے داخلۂ ہند سے اپنے عہد (چودھویں صدی ہجری) تک کے اعیان ومشاہیر کا تذکرہ ہے۔ ثالثاً اس کا تعلق کسی خاص خطۂ ملک وولایت یا علاقہ سے نہیں، بلکہ درہ خیبر سے خلیج بنگال اور بحیرۂ عرب کے ساحل تک اس کا دامن پھیلا ہوا ہے۔'' (۶)

**حسن انتخاب اور مؤرخانہ دیدہ دری:** خومصنف لکھتے ہیں:

''میں نے زرم وبزم کے افسانوں میں سے ان موتیوں کو تلاش کرلیا جن سے محل الجواہر تیار ہوسکتا ہے'' (۷)

**صاحب ترجمہ کے اصل امتیاز وکمال اور اس کی حیثیت کا تعین:** علامہ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''ابن خلکان کی اصلی خصوصیت یہ ہے کہ جس کا ترجمہ لکھتا ہے اس کے اصل موضوع اور امتیازی علم کا تعین ابتدائی تعارفی عبارت ہی میں کرادیتا ہے، یہی خصوصیت مولانا عبدالحی صاحب کی ''نزھۃ الخواطر'' میں ہے'' (۸)

**زندگی ودلآویزی:** ''ہمارے مشرقی ادب وتاریخ کی ایک خامی یہ ہے کہ شخصیتوں کے چہروں پر عقیدت و تقدیس کے ایسے دبیز پردے پڑ گئے ہیں اور ان کے خارق عادات وکمالات کو اتنے شغف وانہماک کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ان کے اصلی خط وخال اور ان کی بشریت کے مظاہر، ان کی عادات وخصوصیات اور ان کی بے تکلف مجلسوں کی اصل تصویر دب کر رہ گئی ہے..... مصنف مرحوم نے امکانی کوشش کی ہے کہ تذکرے محض بے جان اور فضائل ومناقب کا ایک بے روح مرقع نہ ہوں'' (۹)

**تنقید، مزاجی خصوصیات اور کمزور پہلوؤں کی نشاندہی:** ''مصنف مرحوم نے اپنے معاصرین کے تذکرے میں تہذیب وشائستگی کے ساتھ (جو ان کی فطرت کا جوہر ہے) ادیبانہ اور بلیغ انداز میں ان کمزور پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو صاحب ترجمہ کے دوسرے علمی وعملی کمالات کے مجموعہ میں موجود ہیں'' (۱۰)

**بے تعصبی اور فراخدلی:** ''مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم نے اولاً تو ''نزھۃ الخواطر'' کا دائرۂ کار محدود نہیں رکھا، بلکہ انہوں نے تمام مذاہب فقہیہ کے پیروؤں، اہل حدیث، حتی کہ فرقۂ امامیہ کے علماء واھل فضل کو بھی لیا، دوسرے انہوں نے تاریخ وتذکرہ کی حد تک "آت کل ذی حق حقه" اور "أنزلوا الناس منازلهم" پر عمل کرنے کی امکانی کوشش کی، صاحبِ ترجمہ کے مخصوص عقیدہ، فرقہ اور اس کے انحراف وشذوذ کا ذکر کرنے کے ساتھ اس کے علمی وذہنی کمالات کا دریادلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے'' (۱۱)

۲۔ **الثقافة الإسلامية في الهند:** اس کتاب میں بقول حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نصاب تعلیم کی تاریخ اور وقتاً فوقتاً اس میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ سب بیان کی گئی ہیں، قدیم تعلیم کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے، پھر اس کے تغیرات اور ان تغیرات کے محرکات واسباب کی نشاندہی کی گئی ہے، ہر زمانہ میں جو علم معیار فضیلت رہا ہے اور جو نصاب تعلیم کا مقصود سمجھا گیا ہے اس کو بھی معین کیا گیا ہے'' (۱۲)

اس کتاب میں علوم آلیہ کے علاوہ علوم عقلیہ اور فنونِ نظریہ اور پھر ان سب کے علاوہ عربی، فارسی، اردو، ہندی شاعری کا جائزہ اور ہندوستان کے شعراء کا منتخب کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔ ..... اس طرح یہ کتاب شرق اوسط اور عالم اسلام نیز مغرب میں ہندوستان کو علمی حیثیت سے متعارف اور مسلمانوں

کی علمی و دینی خدمات سے واقف کرانے کا ایک مؤثر ذریعہ بن گئی ہے، اور ہندوستانی مسلمانوں کی تصنیفات کی ایک ایسی ڈائرکٹری کی حیثیت رکھتی ہے جس سے طلباء وفضلاء، مصنفین و محققین اپنے علمی مقالوں اور تحقیقی مباحث میں بیش قیمت مدد و رہنمائی حاصل کرسکتے ہیں'' (۱۳)

**۳۔ الهند فی العهد الإسلامی:**

یہ کتاب تین فنون پر مشتمل ہے: (۱) فن جغرافیہ، (۲) فن تاریخ، (۳) فن خطط وآثار۔

''حیات عبدالحی'' میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے لکھا ہے کہ:

''جغرافیہ کے حصے میں قدیم و جدید تاریخی و مذہبی وتمدنی حیثیتوں سے ہندوستان پر نظر ڈالی گئی ہے اور ہر حیثیت سے یہ حصہ مکمل ہے، تاریخ کے حصے میں مسلمانوں کے عہد کی تاریخ مجتہدانہ انداز سے لکھی گئی ہے، اور ہندوستان کا کوئی اسلامی حکمراں خاندان ایسا نہیں جو اس میں ذکر نہ کیا گیا ہو، اکثر تاریخی اغلاط جو شائع وذائع ہو چکے ہیں ان کی تصحیح کی گئی ہے۔ حصۂ ثالث بالکل نئی چیز ہے، شاہانِ اسلام کے عہد میں ہندوستان میں جو ترقیاں ہوئی ہیں وہ سب اس میں بیان کی گئی ہیں، مسلمانوں کے عہد کا تمدن وطرز معاشرت، شاہانِ اسلام کے ہر ہر عہد کے رسوم اور معاشرت کی تبدیلیاں، ان کے محاصل خراج وطریق حکمرانی وغیرہ سب پر غالب استقصاء کے ساتھ بحث کی گئی ہے'' (۱۴)

**۴۔ یاد ایام:**

''اس کتاب میں (جو درحقیقت گجرات کی تاریخ پر مشتمل ہے) شاہان گجرات کے خصائص حکمرانی، اصلاحات ملکی، زراعت، صنعت وحرفت کی ترقی، علوم وفنون کی اشاعت وفروغ، مدارس کا قیام، ماہرین فنون کا تعارف، گجرات کے وزرائے باکمال اور علمائے نامدار کا تذکرہ، ان کے کارنامے اور سلاسلِ طریقت سبھی ضروری مضامین اختصار سے آگئے ہیں'' (۱۵)

اس کتاب میں مصنف کی شان ادبیت اور مؤرخانہ دیدہ وری دونوں نقطۂ عروج پر ہیں، کتاب پڑھتے جایئے اور سر دھنتے جایئے، ''دریا بکوزہ'' کا صحیح مصداق!

یہ تھی مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخی خدمات کی ہلکی سی جھلک، جو انتہائی اختصار کے ساتھ آپ کو دکھلائی گئی، لیکن اس کا خیال رکھا گیا کہ یہ تحریر نہ ایجاز مخل ہو نہ طول ممل۔ اللہ تعالیٰ مصنف مرحوم کو غریقِ رحمت کرے اور ان کے خدمات کا صلہ اپنی شان کے مطابق عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

**حواشی**

(۱) یادرفتگاں ص ۱۷۔ از علامہ سید سلیمان ندوی
(۲) نگارشات ص ۱۷۸۔ از مولانا عبداللہ عباس ندوی
(۳) گل رعنا ص ۳۔ از حکیم سید عبدالحی حسنی
(۴) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص ۳۵۱، ۳۵۰۔ ترتیب مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی
(۵) حیات عبدالحی ص ۲۸۹/۲۸۸۔ از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
(۶) ایضاً ص ۲۹۸/۲۹۷
(۷) ایضاً ص ۳۰۲
(۸) ایضاً ص ۳۰۳
(۹) ایضاً ص ۳۰۶
(۱۰) ایضاً ص ۳۱۲
(۱۱) ایضاً ص ۲۱۵
(۱۲) ایضاً ص ۲۳۱
(۱۳) ایضاً ص ۲۲۴/۲۲۳
(۱۴) ایضاً ص ۳۲۵
(۱۵) ایضاً ص ۳۳۳/۳۳۲

☆☆☆

تنقید وادب

# عربی کے مشہور ادیب احمد امین کی خودنوشت سوانح 'حیاتی'۔ ایک مطالعہ

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

عربی زبان میں خودنوشت سوانح عمریاں بہت سی موجود ہیں۔عہد جدید میں احمد امین کی ''حیاتی'' اور طہ حسین کی ''الایام'' نے بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی ہے۔ راقم السطور نے دونوں کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، اور وہ اس نتیجے تک پہنچا کہ صرف گل افشانی گفتار اور ادب وانشاء کے معیار کو سامنے رکھا جائے تو ''الایام'' زیادہ وزن دار کتاب ہے۔اسی لیے اس نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے ہیں، اس کتاب میں طہ حسین کی تحریر بغیر شراب کا نشہ ہے، لیکن کسی کتاب کی افادیت اور اہمیت صرف ادب وانشاء کے معیار کو سامنے رکھ کر نہیں طے کی جاسکتی ہے۔زندگی کے تجربات اور علمی وفکری خصوصیات اور شخصیت کی تشکیل کے لازمی عناصر اور ان کے فائدے کو معیار بنایا جائے تو ''حیاتی'' کا درجہ ''الایام'' سے بہتر اور بلند تر ہے۔طہ حسین کی ''الایام'' تو وہ کتاب ہے جس کو اگر پوری قوت سے نچوڑا جائے تو شگفتہ بیانی اور لن ترانی کے سوا علم وتحقیق کا کوئی قطرہ اس سے مشکل سے برآمد ہوگا۔جبکہ ''حیاتی'' میں قدم قدم پر زندگی کے قیمتی اور انمول تجربات سامنے آئیں گے، جن سے ایک باذوق قاری کا دامن علم وفکر کے بیش بہا موتیوں سے بھر جائے گا۔ خالص ادبی نقطہ نظر سے بھی یہ کتاب ''الایام'' کے ہم پلہ نہ سہی لیکن بہت وقیع اور خوبصورت ہے، بہت سی جگہوں پر احمد امین نے اپنی شیریں گفتاری کا جادو جگایا ہے، اور یہ اندازہ ہر اس شخص کو ہوگا جس نے عربی زبان میں ''حیاتی'' کا مطالعہ کیا ہے۔مجموعی اعتبار سے ''حیاتی'' میرے نزدیک ''الایام'' سے زیادہ پسندیدہ اور مفید کتاب ہے۔اردو خواں حضرات کو بات سمجھانے کے لیے مولانا آزاد کی کتابوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ مولانا آزاد کی ایک کتاب 'غبار خاطر' ہے، یہ خالص ادبی کتاب ہے، اور اردو انشاء کے لحاظ سے زرکامل عیار کی حیثیت رکھتی ہے، مولانا آزاد کی کتابوں میں اسی کتاب کے سب سے زیادہ ایڈیشن نکلے ہیں، لیکن علم وآگہی اور فکر وتحقیق کے اعتبار سے مولانا آزاد کی دوسری کتابوں جیسے 'تذکرہ' یا 'ترجمان القرآن' کا پایہ زیادہ بلند ہے، اور اس میں ادب کا جمال بھی موجود ہے، اور ان دونوں کتابوں کی افادیت اور اہمیت 'غبار خاطر' سے کہیں زیادہ ہے۔لیکن مقبولیت زیادہ غبار خاطر کو حاصل ہوئی۔''حیاتی'' میں بھی ادب کا جمال موجود ہے، لیکن جس طرح لیلائے شب کی زلف برہم میں دمکتے ہوئے ستاروں کا حسن دیکھنے کے لیے بینائی کی شرط ہے، اسی طرح عربی زبان کی کسی کتاب کے ادبی حسن سے آشنا ہونے کے لیے عربی زبان کا جاننا بھی ضروری ہے۔''حیاتی'' کی ادبی حیثیت بھی مسلم ہے، کتاب میں جو لطائف اور معانی ہیں اور جو افکار واقدار پیش کئے گئے ہیں وہ مستزاد ہیں۔

احمد امین عربی کے بہترین نثر نگار، فن کار، سوانح نگار، معلم ومؤرخ، یونیورسٹی کے استاذ اور عربی ادب کے نقاد تھے۔احمد امین بایں ہمہ قابلیت وعبقریت مجدد اور مصلح نہیں تھے، اور نہ انقلابی شخصیت کے حامل تھے۔ان کی مثال اس موسیقی کار کی طرح ہے جو کسی بستی میں آگ لگنے کے باوجود آگ بجھانے کی فکر نہ کرے اور بستی کے نزدیک درخت کے سایے میں بیٹھ کر بانسری بجاتا رہے، ان کے والد نے اسی انداز سے ان کی تربیت کی تھی، ان کے والد درسی کتابوں

کی تدریس وتفہیم کے ماہر تھے لیکن اخبارات کے مطالعے سے اور سیاست سے گریزاں رہتے، گردوپیش میں کوئی بیماری پھیل جائے یا سیلاب آجائے یا زلزلہ آجائے وہ ان سب سے بے نیاز مطالعہ میں یا اپنے معمولات میں، یا گھریلو فرائض میں مشغول رہتے۔ احمد امین نے اسلامی تاریخ اور اس کے مدوجزر کا تفصیلی لیکن معروضی مطالعہ کیا تھا، اور ایک نہیں بلکہ متعدد کتابیں اس موضوع پر لکھیں، ان پر یہ مصرعہ صادق آتا ہے ''داستان فصل گل خوش می سرائد عندلیب''، ان کا مزاج خالص عقلی، علمی اور فکری تھا۔ وہ سبک ساران ساحل کی طرح دور سے طوفاں کا نظارہ کرتے تھے، وہ جمال الدین افغانی کی طرح انقلاب بردوش شخصیت نہیں رکھتے تھے، اسی لیے مسلمانوں کے زوال اور یورپ کے عروج واقبال سے ان کا دل ویسا بے چین نہیں ہوتا تھا جیسا برصغیر میں علامہ اقبال کا یا مولانا مودودی کا، یا مولانا ابوالحسن علی ندوی کا، یا مصر میں سید قطب شہید کا دل بے چین اور مضطرب رہتا تھا۔ اقبال کا سارا کلام، مودودی صاحب کی ''تنقیحات'' وغیرہ مختلف تحریریں، اور علی میاں کی کتاب ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' اور سید قطب کی ''جاہلیۃ القرن العشرین''، یہ کتابیں ان حضرات کے اضطراب کی آئینہ دار ہیں، یہ اضطراب بڑی نعمت اور اللہ تعالی کا انعام ہے، اور ہر شخص کو میسر نہیں ہوتا، اسی لیے اقبال نے شکوہ کیا تھا۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

احمد امین کے کئی اسفار کا اس خودنوشت میں تذکرہ ہے، اس میں ترکی کا سفرنامہ بھی ہے، مصطفیٰ کمال نے جو ترکی کا حلیہ بگاڑا تھا، اور اس کا قبلہ یوروپ کی طرف کردیا تھا، اس کا بس سرسری تذکرہ ہے، لیکن مصطفیٰ کمال پر جو تاریخ اسلام کے بڑے مفسدین میں شمار کئے جانے کے لائق ہے، کوئی نقد اور کوئی تبصرہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بگاڑ احمد امین کے ٹھنڈے مزاج کو برہم نہیں کرسکا۔ ان کی طبیعت تالاب کے پانی کی ساکن سطح کی طرح ہے کہ جس میں کوئی تموج اور تلاطم نہیں ہے، ان کا مزاج ملی اور اجتماعی معاملات میں ان کے اپنے چوب قلم کی طرح خشک ہے اور یخ بستہ ہے، یہی وجہ ہے کہ احمد امین کی علمی منزلت کی وجہ سے مولانا علی میاں نے اپنی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' پر مقدمہ کی فرمائش کی تو انہوں نے مقدمہ تو لکھا، لیکن کتاب کی حرارت اور مقدمہ کی برودت کے درمیان تضاد پایا گیا، اور لوگوں نے محسوس کیا کہ اس مقدمہ نے کتاب کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچایا ہے، اور جب سید قطب نے کتاب پر اس کی روح کے مطابق طاقتور مقدمہ لکھا تو اس نقصان کی تلافی ہوئی اور پھر آئندہ ایڈیشن سے احمد امین کے مقدمہ کو ہٹادیا گیا۔ ان سب کے باوجود احمد امین کی علمی وادبی حیثیت مسلم ہے۔ اگرچہ طہ حسین کے حلقوں نے ان کی ادبی حیثیت کا اعتراف نہیں کیا ہے، اور طہ حسین کے شاگرد رشید شوقی ضیف نے مصر کے ادباء پر اپنی کتاب میں ان کا نام ہی غائب کردیا، یہ حلقہ ان کو مؤرخ اور محقق تو سمجھتا ہے لیکن ادیب نہیں۔ اس حلقے کے لوگ ادب کو شعروافسانہ میں محصور سمجھتے ہیں، طہ حسین کے نزدیک حقیقی ادب بس یہی ہے، اس طرح کے نثری ادب کے لیے انہوں نے ''الادب الانشائی'' کی تعبیر اختیار کی ہے، باقی تاریخ ادب اور نثر کے دیگر اصناف کو انہوں نے ''الادب الوصفی'' کہہ کر حقیقی ادب کے دائرے سے خارج کردیا ہے۔ اردو داں حلقے کے سمجھنے کے لیے اسے اس طرح سے کہا جاسکتا ہے کہ طہ حسین کے نزدیک شبلی کی شاعری کو یا شعرالعجم کو ادب کے دائرے میں رکھا جاسکتا ہے لیکن سیرت النبی، الفاروق، اور سیرۃ النعمان جیسی کتابیں ان کے نزدیک ادب کے دائرے سے باہر ہوں گی۔

ضروری نہیں کہ طہ حسین کی بات صحیح مانی جائے لیکن جو بات مسلم ہے اور جس کا اعتراف کیا جانا چاہئے وہ یہ کہ 'الایام'' کی ادبی حیثیت اپنی جگہ پر لیکن احمد امین کی خودنوشت ''حیاتی''، علمی وفکری اعتبار سے زیادہ معتبر، مؤقر اور مفید تر کتاب ہے۔ اس میں ادب کی چاشنی کے ساتھ فکر وعقل کی غذا کا بھی پورا سامان ہے۔ اس کتاب کی زبان وبیان کے حسن کا اعتراف عباس محمود العقاد جیسی شخصیت نے کیا ہے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ احمد امین ادیب سے زیادہ محقق اور مؤرخ تھے۔ ادیب اور شاعر بننے کے لیے جذباتیت ضروری ہے، جس کا تعلق دل سے ہے، لیکن محقق بننے کے لیے منطقیت اور سرگرم جستجو ہونا ضروری ہے اور اس کے لیے عقلیت

لازمی ہے جو احمد امین کے یہاں وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔

احمد امین وہ سب کچھ بنے جو قدرت نے انہیں بنانا چاہا، انسان کی شخصیت کی تشکیل میں غیبی ہاتھ کام کرتے ہیں، اور انسان کو ادھر لے جایا جاتا ہے جدھر قدرت اسے لے جانا چاہتی ہے، اور قدرت انسان کو کدھر لے جانا چاہتی ہے کوئی بھی انسان چاہے پیغمبر ہی کیوں نہ ہو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا ہے جب تک کہ وہاں پہنچ نہیں جاتا ہے۔ یوسف علیہ السلام کے لیے تقدیر الٰہی کا فیصلہ تھا کہ مصر کے تاج وتخت کا ان کو وارث بنایا جائے، انہیں کنویں میں اسی لیے ڈالا گیا کہ مصر جانے والے مسافر انہیں کنویں سے نکال کر مصر لے جائیں اور پھر مصر کے بازار میں انہیں غلام بنا کر اسی لیے فروخت کیا گیا کہ وہ اس بازار سے عزیز مصر کے گھر پہنچ جائیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے کہ " بیچارہ پیادہ تو ہے اک مہرہ ناچیز ۔فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ"۔ شاطر قدرت نے ان کے لیے جو طے کیا تھا وہ ان کو ملا، یہ دنیا عالم اسباب ہے، منزل تک پہنچنے کے لیے انہوں نے طویل سفر کیا، نہ تھکن کا احساس کیا، نہ انہوں نے پاؤں کے چھالے دیکھے، انہیں معلوم تھا کہ زندگی لہو ترنگ ہے جلترنگ نہیں ہے۔ انہوں نے ہمت اور مسلسل عمل سے ساحل مراد تک پہنچنے کی کوشش کی، انہوں نے ریگزار کو چمن اور بنجر زمین کو گل وگلزار بنایا، کتابیں ان کے لیے دن کی رفیق حیات اور رات کی رانیاں تھیں، انہوں نے علمی اور ادبی کاموں میں بے انتہا محنت کی، مسلسل اور بلا انقطاع پڑھنے اور لکھنے کی عادت نے علم ودانش کی دنیا میں ان کی شناخت قائم کردی، صاحبانِ نقد ونظر کی نگاہیں ان پر پڑنے لگیں، پہلے جج بنے، پھر لکچرر بنے اور پھر پروفیسر اور پھر پرنسپل اور پھر شعبہ تصنیف وتالیف کے ڈائرکٹر بنے، اعزازات سے نوازے گئے، دوسرے ملکوں کی علمی کانفرنسوں میں اپنے ملک کی نمائندگی کی، علم وادب کی دنیا میں انہوں نے اپنے مستقبل کو درخشاں بنایا، اور جریدۂ عالم پر انہوں نے نام اور دوام دونوں کو ثبت کردیا۔ عربی زبان وادب اور اسلامیات سے شغف رکھنے والے صرف "حیاتی" کو نہیں بلکہ "زعماء الاصلاح"، "فجر الاسلام"، "ضحیٰ الاسلام" اور "النقد الادبی" وغیرہ کو بھی فراموش نہیں کرسکیں گے، اور ان کی کتابیں گردش شام وسحر کے درمیان زندہ اور تابندہ رہیں گی۔

سوانحی ادب کا مطالعہ دوسروں کے قیمتی تجربات سے مفت فائدہ اٹھانے کے مرادف ہے، اگر مطالعہ کی عادت ہو تو انسان مشاہدے سے زیادہ مطالعے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، انسانی زندگی پر ایک طرف قانون وراثت اپنا کام کرتا ہے، دوسری طرف حالات زندگی کا اس پر عکس پڑتا ہے۔ جب ایک انسان عظیم شخصیتوں کے تجربات اور تاریخ ساز، بلند قامت انسانوں کے حالات پڑھتا ہے تو یہ مطالعہ گزرگاہ حیات میں اس کے لیے قندیل کا کام کرتا ہے، اور وہ ان سے اکتساب نور کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کتاب کے مطالعے سے ایک قاری کو یہ سبق ملے گا کہ بچوں کی تربیت کس درجہ اہتمام کے ساتھ کرنا چاہئے اور ان کے اندر علم وادب کی تخم ریزی کس طرح کرنی چاہئے، اور خود اپنی زندگی کو اولاد کے لیے کس طرح نمونہ بنانا چاہئے، حیا اور سنجیدگی اور غم کی زیریں لہر شخصیت کی تشکیل میں کس قدر مفید ہوتی ہے، دینی ماحول اور قرآن کی تلاوت سے گھر کا ماحول کس قدر نورانی بنتا ہے۔ کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معیار زندگی کی ریس وہ لوگ کرتے ہیں جو ناہنجار اور ساقط الاعتبار ہوتے ہیں، مسابقت کا جذبہ معیار زندگی کے لیے نہیں معیار بندگی کے لیے ہونا چاہئے، تعلیم وتدریس کو ایک بوجھ بنانے کے بجائے طلبہ کے لیے مرغوب شربت کا گلاس بنا کر پیش کرنا چاہئے، گندگی اور غلاظت گھر کے اندر ہو یا باہر ہو اس سے وہ ذوق جمال مردہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور اس نعمت کی حفاظت ضروری ہے، ورنہ مزاج میں بدسلیقگی پیدا ہوجاتی ہے، ذوق جمال کی تربیت کے لیے پھولوں کے حسن اور مناظر قدرت سے رغبت پیدا کی جانی چاہئے، صالح انسان کی صحبت انسان کو صالح بناتی ہے، زندگی اور زبان دونوں میں شگفتگی لانے کے لیے ادبی وشعری ذوق ضروری ہے، کسی بھی کام میں محنت، صبر اور تحمل کامیابی کا زینہ ہے۔ اس طرح کے بے شمار لعل وگہر اور حکمت کے موتی ورق ورق پر چمکتے نظر آئیں گے۔ مصنف نے یہ کتاب کیا لکھی ہے گویا موتی رولنے اور آب حیات گھولنے کا کام کیا ہے۔ ان کی کتاب اس خوبصورت قبا کے مانند ہے جس پر گل بوٹے سجائے گئے ہوں۔

☆☆☆

آخری صفحہ

# شاہانِ وقت کے ذریعہ علماء کی قدردانی

م۔ق۔ن

محمد قاسم بیجاپوری اپنی مشہور کتاب تاریخ فرشتہ میں لکھتے ہیں: ''ایک مرتبہ ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی.....سخت علیل ہوئے (سلطان) ابراہیم شرق ان کی عیادت کو گیا، مزاج پرسی اور ضروری باتوں کی دریافت اور انتظام علاج کے بعد بادشاہ نے ایک پیالہ پانی سے لبریز طلب کیا، اور مولانا کے سر پر سے پیالہ کو تصدق کر کے خود پی لیا اور کہا کہ اے خدا جو بلا (مصیبت) قاضی صاحب کے لئے مقرر ہے، وہ مجھ پر نازل فرما اور ان کو صحت عطا کر''۔

امیر فتح اللہ شیرازی کے انتقال پر اکبر نے ان لفظوں میں اپنے دلی تأثر و تأسف کا اظہار کیا:

اگر بدست فرنگ افتادی وہمگی
خزائن در برخواستی، دریں سودا
فراواں سود کرمی وآں گرامی
گوہر رابس ارزاں خریدمی

اگر فرنگی ان کو قید کر اور میرا تمام خزانۂ سلطنت ان کے فدیہ میں مانگے، تو یہ سودا بڑا سستا اور فائدہ مند ثابت ہوتا اور یہ گوہرِ عالی اس قیمت میں بھی ارزاں ہوتا۔

شاہجہاں نے دو مرتبہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کو چاندی میں اور ایک مرتبہ قاضی محمد اسلم ہروی (والد میر زاہد) کو سونے میں تلوایا، یہ قدیم بادشاہوں کا اہل کمال کے اعتراف و اظہار کا طریقہ تھا۔

صاحبِ ''اعضان اربعہ'' مولانا ولی اللہ فرنگی محلی نے بحر العلوم کے مدراس میں شاہانہ استقبال کی تصویر اس طرح کھینچی ہے: ''جب پالکی شاہی کے قریب پہنچی تو آپ نے اترنا چاہا، نواب والا جاہ نے اشارہ کیا کہ تشریف رکھیں اور خود پالکی کو کاندھا دے کر محل میں لائے، اور مسند شاہی پر اپنی جگہ بٹھایا، قدم بوسی کی اور کہا کہ میرے ایسے نصیب کہاں تھے کہ آپ قدم رنجہ فرمائیں اور مکان کو منور کریں''۔

قدیم تعلیمی نظام کا ایک بڑا اثر یہ تھا کہ سلاطینِ وقت اور وزراء کبار کے علاوہ اہل مقدرت اور صاحب جاگیر و جائداد علماء اور اہل علم کی خدمت اور تعاون کو سعادتِ عظمیٰ سمجھتے تھے اور اپنے لئے نجات اور فلاح کا وسیلہ سمجھتے تھے۔

ہندوستان کی اسلامی عہد کی تاریخ نے ان سلاطین و امراء کی قدردانی و قدرشناسی اور اعترافِ کمال کی کثرت سے مثالیں پیش کی ہیں جس کا ایک ہلکا سا نمونہ اور پر پیش کیا گیا۔

آج بھی جو علماء اور اہل علم اسلاف کی روش کو اپنائے ہوئے ہیں اور اسلاف کی شانِ خودداری کو اپنے لئے نمونہ اور آئیڈیل بنائے ہوئے ہیں۔ اہل ثروت روساء اور اغنیاء ان کی جوتیاں سیدھی کرتے ہیں اور ان کی خدمت اور نصرت کو اپنے لیے سعادت سمجھتے ہیں۔

☆☆☆

**(بقیہ صفحہ نمبر ۲۶ کا)**

ایک فقیہ ابو اللیث ایک جگہ لکھتے ہیں کہ علم کا ابتدائی حصہ خاموشی، دوسرا غور وفکر، تیسرا حفظ، چوتھا عمل، پانچواں تبلیغ ہے۔ اسی طرح اہل علم کی تین قسمیں ہیں:

(۱) عالم باللہ وبأ مراللہ، جو حدود وفرائض سے واقف ہواور خوف خدا کے ساتھ عمل بھی کرتا ہو)

(۲) عالم باللہ لابأ مراللہ، جو خدا سے تو ڈرتا ہو عمل بھی کرتا ہو مگر مسائل سے زیادہ واقف نہ ہو۔

(۳) عالم بأ مراللہ لا باللہ، جو مسائل سے خوب واقف ہو لیکن اس کے اندر اللہ کا خوف نہ ہو۔

دینی تعلیم کے فارغین خود نمونہ بننے کے بجائے نئے ماحول کا نمونہ بنا چاہتے ہیں، تقویٰ وطہارت، تزکیہ نفس اور اخلاص کے پرندۂ مادیت کی شاخوں پر نئے طرز کے ساتھ لٹکتے نظر آتے ہیں۔ یاد رکھیں کہ علم مثل ٹمٹماتے تاروں سا ہے اور اندھیری رات میں ٹمٹماتے ہوئے تارے روشنی تو دے سکتے ہیں لیکن مسافر کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتے، یہ کام خود مسافر کا ہے کہ وہ اپنی صحیح راہ خود اختیار کریں۔

موجودہ دور میں نہ حصول علم کے شرائط واسباب کے اختیار کرنے کا اہتمام ہے نہ موانع حصول علم سے بچنے کا انتظام و احترام بلکہ اکثر وبیشتر تو شرائط وموانع کا بالکل علم ہی نہیں رکھتے اور اگر کچھ لوگ کچھ علم رکھتے ہیں تو اس سے کوئی مطلوبہ کام نہیں لیتے۔ بس لاپرواہی، آزادئ طبع اور محض غفلت ہی غفلت طاری ہے، "فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمة" عقلمند کا کام حکمت ومصلحت سے خالی نہیں ہوتا، اور حکمت کا تقاضہ ہے کہ اللہ کو راضی رکھا جائے۔ رضائے الٰہی ہی علم کا مقصود و حاصل ہے۔

یا معشر القراء یا ملح البلد
ما یصلح الطعام اذا الملح فسد

☆☆☆


جامعۃ البنات حیدرآباد
JAMIATUL BANATH HYDERABAD

شعبہ حفظ
عالمیت فضیلت

لڑکیوں کا اعلیٰ ومعیاری دینی ۲۸ سالہ قدیم جامعہ

شہر کے اہم مقامات سے بسوں کی سہولت

دینی تعلیم کے علاوہ انگریزی وکمپیوٹر بھی سکھایا جاتا ہے۔ جس کے لئے خاص کمپیوٹر لیب پوری ضرورتوں سے آراستہ ہے۔
عثمانیہ یونیورسٹی (اورینٹل لینگویجس) کے ذریعہ میٹرک، انٹر، بی اے کے امتحانات بھی دلوائے جاتے ہیں۔
ایک سالہ اسلامک ڈپلومہ (کالج کی طالبات کے لئے) شعبہ تربیت۔ دبلوم العالی فی علوم الشرعیہ۔
(فارغات دینی مدارس کے لئے ایک نادر موقع)

والدین سے گزارش ہے کہ اپنی لڑکیوں کی بہترین تعلیم وتربیت کے لئے اس جامعہ میں داخلہ دلوائیں۔

نوٹ: (۱) اضلاع کے طالبات کے لئے جامعہ میں معیاری ہاسٹل کی سہولت ہے۔ (۲) شہر میں اس جامعہ کی اور کوئی شاخ نہیں ہے۔

صاحب خیر حضرات جو جامعہ کا تعاون کرنا چاہتے ہیں
ہمارے بینک اکاونٹ نمبرس:

JAMIATUL BANATH HYDERABAD
Ac/No. 05110011021119. (Andhra Bank)
Ac/No. 19380100018623 (Bank of Baroda)

پتہ: جیون یار جنگ کالونی، روبرو مدینہ میڈیکل ہال، VIP اسکول کی گلی، سعید آباد، حیدرآباد۔
رابطہ نمبر: 7032101979,9848431304,(040)24553534
Website:www.jamiatulbanath.org